

دوسری صدی ہجری میں لکھی گئی ایک سائنسی کتاب

تِہْمَةُ حَسَنٍ

توحید پرستوں کے لیے علم کا لازوال خزانہ

پہلی بار سائنسی تشریفات کے ساتھ

لیکھر: ۱

ترجمہ حدیث:

مولانا سید محمد ہارون زنگی پوری صاحب قبلہ

سائنسی تشریفات

محمد علی سید



دوسری صدی ہجری میں لکھی گئی ایک سائنسی کتاب



توحید پرستوں کے لیے علم کا لازوال خزانہ

پہلی بار سائنسی تشریحات کے ساتھ

لیکچر: 1

ترجمہ حدیث:

مولانا سید محمد ہارون زنگی پوری صاحب قبلہ

سائنسی تشریحات:

محمد علی سید

کتاب: توحید مفضل
 جلد: اول لیکچر: ۱
 ترجمہ حدیث: مولانا سید محمد ہارون زنگی پوری (مرحوم)
 سائنسی تشریحات: محمد علی سید
 تعداد اشاعت: ایک ہزار
 سین اشاعت: ۲۰۱۲ء
 سروق: فضہ علی سید
 زیراہتمام: اسلام اینڈ سائنس ریسرچ فاؤنڈیشن - پاکستان
 (زہرا اکیڈمی پاکستان کا ذیلی ادارہ)
 کمپوزنگ: سسٹم گرافس
 پرنٹر: شیری پرنٹنگ پرنس
 قیمت: ۳۰۰ روپے

ISBN: 978-969-9738-14-2

جملہ حقوق حفظ ہیں

اس کتاب کے کسی بھی حصے کی اشاعت کے لیے ادارے سے اجازت لینا ضروری ہے۔ اس
 حوالے سے حکومت پاکستان کے قوانین موجود ہیں۔ کتاب کی نقل یا اس کے کسی حصے کو
 بلا اجازت شائع کرنے کی صورت میں متعلقہ شخص / ادارے کے خلاف کارروائی کی جاسکتی ہے۔

شرفِ انتساب

امام جعفر صادق علیہ السلام کے صحابی
شیخ مفضل ابن عمرؓ کے نام۔

جنہوں نے ان علوم کو اپنے آقا مولا سے براہ راست حاصل کیا،
امام علیہ السلام کی موجودگی و نگرانی میں
اس کلام کو اپنی انگلیوں اور قلم کے ذریعے کاغذ پر منتقل کیا۔

اور اس دور میں جب لوگ پوچھتے ہیں کہ علم لدنی کیا ہوتا ہے؟
اللہ رب علیم و خبیر نے ایسے موقع پیدا کر دیے کہ
علوم محمد و آل محمدؐ کے ان گروں بہاچے موتیوں کو
دنیا کے سامنے دوبارہ پیش کرنا آسان ہو گیا۔

جوز مانوں اور زبانوں کے بد لئے سے دنیا کی نظروں سے
او جھل ہو گئے تھے۔

توحید مفضل کی یہ تین کتابیں، کل کا محض ایک جز اور علم لدنی
کی صرف ایک جھلک ہے
لیکن مشرق سے مغرب تک کے سائنس دانوں کو یہ سمجھانے
کے لیے کافی ہے،

کہ گزشتہ سارے زمانوں میں سائنس نے جو کچھ معلوم کیا،
صاحبان ذکر اور والیان امر نزول قرآن کے زمانے ہی میں
ان علوم کو بیان کر چکے تھے۔

محمد علی سید

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

القرآن

”اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے یہ
بھی (ایک حیران کن نشانی) ہے کہ اس
نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا پھر یہ کا یک تم
آدمی بن کر چلنے پھرنے لگے“

(سورہ روم: آیت: ۲۰)

نهج البلاغہ

”یہ انسان بھی تعجب کے لا اق ہے کہ ایک
ہڈی سے سنتا ہے، گوشت کے ایک لوحڑے
سے بولتا ہے اور ایک سوراخ سے سانس لیتا
ہے۔“

(حضرت علی بن طالب علیہ السلام)

فہرست

9	محمد علی سید	چند گزارشات:
18	علامہ طالب جوہر صاحب	توحید مفضل:
20	ڈاکٹر وقار یوسف عظیمی	توحید مفضل:
22	ڈاکٹر سید محمد رضا زیدی	توحید مفضل:
26	جناب مفضل ابن عمرؓ بعثت کی خدمات و منزالت	جناب مفضل ابن عمرؓ بعثت کی خدمات و منزالت
30	امام جعفر علیہ السلام کی گفتگو کا پس منظر	امام جعفر علیہ السلام کی گفتگو کا پس منظر
35	مفضل ابن عمرؓ کی زبانی	مفضل ابن عمرؓ کی زبانی
37	کلام الامام، امام الكلام	کلام الامام، امام الكلام
باب: 1: ہم اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرتے ہیں		
49	باب: 2: اگر یہ لوگ اپنے وجود پر ہی غور کر لیتے
60	باب: 3: اگر انسان کا بچہ عقل کامل کے ساتھ پیدا ہوتا
68	باب: 4: پچھے رو تے کیوں ہیں؟
74	باب: 5: انسانی اعضاء کی خلقت
81	باب: 6: غذا کس طرح خوش گوار ہوتی ہے؟
87	باب: 7: غذا اور خون کی نالیاں
94	باب: 8: جسم کی نشوونما
102	باب: 9: عظیم فضیلت جو صرف انسان کی عطا کی گئی

111	باب: 10 پانچ حواس اور ان کے کام
120	باب: 11 تمام مخلوقات کا ایک ہی خالق ہے
130	باب: 12 امام جعفر صادقؑ کا دور اور جدید سائنسی زمانہ
137	باب: 13 دانست، ہونٹ اور آنکھیں
144	باب: 14 انسان کی دو اقسام، مرد اور عورت
151	باب: 15 افزائشِ نسل کے حیران کن طریقے
156	باب: 16 انسان خود ایک مجذہ
164	باب: 17 دل کو سینے میں کیوں رکھا گیا؟
173	باب: 18 اعضاء کی موزونیت
186	باب: 19 گفتگو کی صلاحیت اور اللہ کی حکمتیں
196	باب: 20 اگر علم غیب بھی انسان کو دے دیا جاتا؟
207	باب: 21 ہر انسان دوسرے سے مختلف کیوں؟
214	باب: 22 جانداروں کے جسم ایک مخصوص حد سے آگے کیوں نہیں بڑھتے؟

محمد علی سید

چند گزارشات

کب سے الجھا ہوا ہوں کہ اس کتاب کا دیباچہ لکھ سکوں!
بات تفصیل سے کروں تو ممکن ہے آپ اکتا جائیں۔ مختصر بات کی جائے تو اپنی دلی کیفیت کا
اظہار ممکن نہ ہو سکے گا۔

”توحید الائمه“ نامی بیش قیمت کتاب میرے ہاتھ میں اس وقت آئی جب میں اس کی قدر و
قیمت کا اندازہ لگانے سے بالکل قاصر تھا۔ یہ ایسا ہی تھا کہ کسی بچے کے ہاتھ میں ہیرے جواہرات
دے دیے جائیں۔ بچہ ان جواہرات کی قدر و قیمت کا اندازہ کس طرح کر سکتا ہے!

لیکن 1974ء سے 2010ء تک پورے 36 سال یہ کتاب میرے دل و دماغ پر چھائی
رہی۔ کبھی یہ کتاب میرے پاس رہی اور کبھی غائب ہو گئی..... البتہ ہیرے جواہرات کی چمک میری
روح کو مسلسل اپنی طرف متوجہ کرتی رہی۔ میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ ایک زمانہ آئے
گا کہ میں اس کتاب کو کسی حد تک سمجھ سکوں گا اور اس کی سائنسی تشریع بھی لکھ سکوں گا۔

جب یہ کتاب مجھے ملی تو میں کچھ نہیں جانتا تھا سوائے اس کے کہ یہ کلام امام ہے اور دل میں
خیال آتا تھا کہ کاش کوئی عالم شخص علم کے اس خزانے کو آج کی عقل و فہم، آج کے اسلوب اور آج
کی زبان میں منتقل کر سکے۔ علماء کے لیے یہ کام مشکل نہیں تھا لیکن مجھے جیسے جاہل نے اس کتاب
کے صرف ایک حصے یعنی ”توحید مفضل“، کو کسی قدر سمجھنے میں 36 سال لگائے۔

جب میں نے ”توحید مفضل“ کی تشریع لکھنا شروع کی تو اس بچے کو ان ہیرے جواہرات کی
قدرو قیمت کا کسی قدر احساس ہوا۔ اب معلوم ہوا کہ انھیں ہیرے جواہرات کہنا بھی مناسب
نہیں۔ ہیرے جواہرات کی قدرو قیمت میں بھی اتار چڑھاؤ آتا رہتا ہے۔ کلام امام کی عظمت کا
لیکھر: 1 9

کوئی اندازہ ہی کب کر سکتا ہے کہ اس کی قیمت کا تعین کر سکے!

ما�چ 2010ء کا زمانہ تھا۔ ایک دن مجھے ”توحید مفضل“ کا خیال آیا۔ شاید جناب مفضل ابن عمر نے میرے کان میں سرگوشی کی ہو۔ ”کب تک ٹالتے رہو گے۔ تمہیں وہ علم اور صلاحیتیں عطا کر دی گئی ہیں جن کے لیے تم دروازہ کھٹکھٹا رہے تھے۔ تمہیں معلوم ہی نہیں کہ دروازہ کب کا کھل چکا ہے..... اس طرح نہ سوچو۔ علماء کے اور بہت سے فرائض ہیں۔ تم اپنا فرض نبھاؤ۔ انھیں ان کا کام کرنے دو۔

پھر ایک دن اچانک ہی کسی نے میرا ہاتھ تھام کر میرے منتشرہ ہن کو یکسو کر دیا اور میں لوکنٹی وٹی کی حالت سے نکل آیا اسی لیے ”توحید مفضل“ کے تین یا چھ سو کی تشریع محض چند ماہ میں مکمل ہو گئی۔ میں دعا یہی کر رہا تھا کہ بس اللہ تعالیٰ مجھ سے یہ خدمت لے لے۔ پھر اپنی معافی اور مغفرت کے ساتھ جب مناسب جانے مجھے اپنے پاس بلائے۔ (اگرچہ وہ دور ہی کب تھا جو قریب کرے!) میں آپ کو ”توحید الائمہ“ اور ”توحید مفضل“ کا فرق بتانا تو بھول ہی گیا۔ توحید الائمہ کتاب 1970ء میں پہلی بار رضویہ بک ڈپو کراچی سے شائع ہوئی۔ پھر یہی کتاب جوں کی توں لکھنؤ کے ایک اشاعتی ادارے نے شائع کی۔ 2010ء میں اسی کتاب کوتازہ کمپوزنگ (اور نئی اغلاط) کے ساتھ اسلام آباد کے ایک کتب فروش نے شائع کیا۔ 2011ء میں اسی کتاب کو اسلام آباد، ہی سے مرحوم مولانا ثقلین کاظمی صاحب نے بڑے اچھے گیٹ آپ اور نئی کمپوزنگ کے ساتھ شائع کیا۔ بہر حال مختلف ادارے مولانا سید محمد ہارون زنگی پوری صاحب کا وہی ترجمہ شائع کرتے رہے ہیں جو غالباً 1970ء میں رضویہ بک ڈپو نے کراچی سے شائع کیا تھا۔ کتب فروش حضرات اس کے سوا کر بھی کیا سکتے تھے! یہ کام تودینی اداروں اور علماء کا تھا کہ وہ اس پر کام کرتے اور اسلامی علوم کے اس خزانے کو دنیا کے سامنے اس طرح پیش کرتے کہ جس طرح اس کا حق تھا۔

اس کتاب کے مترجم معروف عالم دین مولانا سید محمد ہارون زنگی پوری صاحب ہیں۔ مولانا نے یہ ترجمہ آج سے ستر اسی سال پہلے کیا تھا جب بر صغیر میں عربی اور فارسی زبان مستعمل تھی۔ یہ

ترجمہ حقیقت میں توحید پرستوں پر مولانا زنگی پوری صاحب کا ایک احسان تھا اور ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت فرمائے اور ان کے درجات کو بلند کرے۔

آپ جانتے ہیں زبانیں تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ عربی، فارسی کے الفاظ اب ہماری نئی نسل کی سمجھ میں نہیں آتے۔ اب ہماری نئی نسل نجم آفندی کے نوہ، میرزاد بیر کے سوز و سلام اور میرانیس کے مرشیے بھی رومان اردو میں لکھ کر یاد کرتی ہے۔ ایسے میں مولانا زنگی پوری صاحب کا ترجمہ نئی نسل کس حد تک سمجھ سکتی ہے، اس کا اندازہ آپ خود کر سکتے ہیں۔

توحید الائمه کا ابتدائی حصہ ”توحید مفضل“ کہلاتا ہے۔ اس حصے میں اثبات وجود خدا کے حوالے سے امام جعفر صادق علیہ السلام کے چار لیکھرز ہیں۔

توحید مفضل کے تین لیکھرز جن کی سائنسی تشرع کی سعادت مجھے حاصل ہوئی ان میں بہت سارے علوم زیر بحث آئے ہیں۔ مثلاً علم الابدان (اناثیمی)، فعلیات (فزيالوجی)، طبیعت (فرزکس)، کیمیا (کیمیٹری)، اپسیس سائنس (خلائی سائنس)، جیوگرافی، علم الحیوانات (زولو جی)، علم الاشجار (بوٹی)، فلکلیات (آسٹرونومی)، اور علم موسمیات..... ان میں سے بیشتر علوم وہ ہیں جن کے بارے میں امام جعفر صادق علیہ السلام کے عہد سے صدیوں پہلے اور آپ کے صدیوں بعد تک اس کڑھ ارض پر کسی عام انسان کو کچھ معلوم نہیں تھا سو اس کے جواب کے مشاہدے میں آیا۔ یونان کے نامور فلسفی ارسطو نے بہر حال انا ٹومی، آسٹرونومی، ایمپر ولوجی، زولو جی، فرزکس، اور زولو جی کے موضوع پر کتابیں اور رسائل تحریر کیے تھے اور وہی کچھ لکھا جواب کے مشاہدے میں آیا لیکن اس نے بھی مخلوقات کو ان کے خالق کی نشانی کے طور پر نہیں دیکھا اور نہ خالق و مخلوق کے رشتے کو جاننے کی طرف توجہ مرکوز کی بہر حال ارسطو کے نظریات کے ایک بڑے حصے کو جدید سائنسی تحقیقات کے بعد سائنس دانوں نے حقائق سے بعید قرار دیا ہے۔

یونان کے علماء، فلکلیات اور علم الابدان کے بارے میں بھی آج کی سائنس کے مقابلے میں

بہرھائی بہت سرسری معلومات رکھتے تھے۔ اس وقت تمام دارودار نظریات پر تھا جن کی مشاہداتی تصدیق ایک ناممکنی بات تھی۔

فلکیات کے باب میں یونان کے علمی معاشرے کے عام افراد کے اعتقادات کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ جہاں تک یونانی علماء کا معاملہ ہے تو یونانی علماء بھی ایک بے حرکت اور محدود کائنات کے قائل تھے۔ انیسویں صدی کے نصف تک آئزک نیوٹن اور آئن اسٹائن جیسے نامور سائنس دان بھی اسی سحر میں گرفتار ہے۔ حتیٰ کہ ایڈوان ہبل نامی سائنس دان نے 1929ء میں جدید اور طاقتور ٹیلی اسکوپ کے ذریعے متحرک اور پھیلتی ہوئی کائنات کے حتمی اور مشاہداتی ثبوت دنیا کے سامنے پیش کیے اور ارسطو سے لے کر آئن اسٹائن تک کے بہت سے نظریات کو ماضی کے حوالے کر دیا۔

بات لمبی ہو جائے گی..... عرض کرنے کا مقصد یہ تھا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے ان یکچھر ز میں اُن موضوعات پر تفصیلی گفتگو فرمائی جن موضوعات کو آپ کے ایک ہزار سال بعد باقاعدہ سائنسی علوم کی حیثیت حاصل کرنا تھی۔ ان بہت سارے علوم کے مطابق امام علیہ السلام کے کلام کی سائنسی تشریحات کرنا مجھے جیسے کم علم آدمی کے لیے کس قدر مشکل ہونا چاہیے تھا، شاید آپ اس کا اندازہ نہ کر سکیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے مجھے اس میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ پاپولر سائنس کی کتابیں، ویب سائٹ، نیشنل جیوگرافکس، ڈسکوری اور اپنیمیل پلائزٹ کی دستاویزی فلموں نے کلامِ امام کو سمجھنے میں میری بہت مدد کی۔

ماحولیات، جنگلی حیات، میڈیکل سائنس اور اپسیں سائنس کے بارے میں جو کچھ ان فلموں میں دکھایا جاتا ہے وہ اثبات وجودِ خدا کی ناقابل تردید، لازوال اور انہت نشانیاں ہیں۔ ایسی عظیم الشان نشانیاں جنھیں نہ انسان قائم رکھ سکتا ہے اور نہ انھیں کبھی فنا کر سکتا ہے۔ ان میں سے کسی ایک نشانی کو مٹانے کا مطلب خود فنا ہو جانے کے متراوٹ ہوگا۔ مثلاً صرف چیزوں کی کسی ایک، ہی قسم کو کمل طور پر ختم نہیں کیا جاسکتا اور اگر کر دیا جائے تو کہہ ارض کا پورا ماحدوں غیر متوازن ہو جائے گا۔ مغرب والے یہ بات جانتے ہیں اسی لیے اللہ تعالیٰ کی ان نشانیوں کو بچانے کے لیے تحقیق

کرتے ہیں غو، رو فکر کرتے ہیں لاکھوں کھربوں ڈال رخچ کرتے ہیں لیکن..... اللہ کا نام نہیں لیتے بلکہ ہر چیز کو نیچر سے منسوب کر دیتے ہیں۔ یہ جانے بغیر (یا جاننے کے باوجود) کہ نیچر تو ایک نظام ہے جسے خالق کائنات نے اپنی مخلوقات میں جاری و ساری کیا ہے۔

(اس موضوع پر امام علیہ السلام کی گفتگو آپ اس کتاب کے پانچویں باب میں ملاحظہ کریں گے) کتاب ”توحید الائمه“ کا ترجمہ جس سے میں نے استفادہ کیا، اس میں کئی مسائل تھے۔ مثلاً فاضل مترجم نے کلام امام کی وضاحت کے لیے بعض مقامات پر بریکٹ میں کچھ نوش تحریر فرمائے لیکن کتابت کرنے والے نے اکثر مقامات پر مترجم کی تحریر کے آغاز میں تو بریکٹ لگادیا لیکن اس کے آخر میں لگانا بھول گیا یا اس کے برعکس شروع میں بریکٹ لگانے کے بجائے آخر میں بریکٹ لگادیا۔ بظاہر یہ ایک معمولی سی غلطی معلوم ہوتی ہے لیکن، دراصل بہت بڑی غلطی ہے۔ پڑھنے والا سمجھنہیں پاتا کہ کہاں تک کلام مترجم ہے اور کہاں سے دوبارہ کلام امام کا آغاز ہو رہا ہے۔ اس مسئلے کو نظر انداز کرنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس لیے میں نے بار بار عربی وال دوستوں کو زحمت دی کہ وہ عربی متن کو پڑھ کر بتائیں کہ کلام امام کہاں سے شروع ہو رہا ہے یا اس کے برعکس کہاں تک کلام مترجم ہے۔

تیرے لیکھر کے تو آغاز ہی میں رکاوٹ پیدا ہو گئی۔ اس لیکھر کا آغاز اردو میں اس طرح ہو رہا ہے کہ امام علیہ السلام نے فرمایا: ”دیکھو مفضل! اللہ تعالیٰ نے آسمان کو کیسا سبزرنگ کا بنایا!“ آپ بھی جانتے ہیں کہ آسمان دنیا کے کسی بھی حصے میں سبزرنگ کا نہیں ہوتا۔ کلام امام غلط نہیں ہو سکتا۔ قلم رک گیا۔ میں کئی دن تک اس مسئلے میں الجھا رہا۔ اگر امام علیہ السلام نے آسمان کو سبزر کہا ہے تو ہمیں اپنی اصلاح کرنا ہو گی اور آیندہ سبزر کو نیلا اور نیلے رنگ کو سبزر کہنا پڑے گا۔

ایک مہربان دوست نے نیٹ پر عربی متن کو دیکھا تو وہاں آسمان کے لیے ”اخضر“ ہی لکھا تھا۔ اخضر کا مطلب ظاہر اس بزیر ہی ہے۔ پھر انہوں نے ایک ویب سائٹ پر توحید مفضل کا عربی متن اور فارسی ترجمہ دیکھا۔ وہاں عربی متن میں ”اخضر“ کو تبدیل کر کے ”ارزق“، یعنی نیلا لکھ کے مسئلہ

حل کر دیا گیا تھا۔

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔

میں نے اپنے محترم دوست سے درخواست کی کہ آپ کسی معتبر عربی لغت میں دیکھ کر بتائیے، ممکن ہے ”اخضر“ کے کچھ اور معنی بھی ہوں۔ قدیم اور معروف عربی لغت ”عروض اللغات“ دیکھی گئی تو مسئلہ حل ہو گیا۔

عربی میں آسمان کو اخضر اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کی وجہ سے زمین پر ہر یا می پیدا ہوتی ہے۔ اخضر اس رنگ کو بھی کہتے ہیں جو سیاہ اور سفید کے درمیان ہو۔ (صحیح سوریہ اور شام کے وقت آسمان کا رنگ سلیٹی ہی نظر آتا ہے۔)

اس کے علاوہ عربی لغت کے مطابق اخضر اس رنگ کو بھی کہا جاتا ہے جونگا ہوں کو اچھا لگے۔ نیلا آسمان آنکھوں کو کس قدر بھلا معلوم ہوتا ہے، آپ بھی جانتے ہوں گے۔ امام علیہ السلام نے اس لفظ کو ان تمام ہی معنی میں استعمال فرمایا ہے۔

یہ اعتراف کرنے میں کوئی حرج نہیں کہ میں ”توحید مفضل“ کی مکمل تشریح کرنے میں ناکام رہا۔ آیندہ آنے والے صاحبان علم اس کلام کی مجھ سے کہیں بہتر تفسیر پیش کر سکیں گے۔ یہ کام دراصل ایسے شخص کے لیے تھا جو قدیم عربی اور جدید سائنس دونوں پر عبور رکھتا ہو۔ میں نے تو ایک سرسری سا کام کیا ہے۔ یہ اللہ کی قدرت ہے کہ سنگریزے بولنے لگیں، سو کھے ہوئے درخت برگ و بار پیدا کریں اور ان کی شاخیں پھولوں اور پھلوں سے بھر جائیں۔

مولانا شبیر حسن میشی صاحب بڑی مہربان اور علم دوست شخصیت ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ مستقبل پر نظر رکھتے ہیں۔ آنے والے زمانوں میں تبلیغ دین کی ضرورتوں سے بھی آگاہ رہتے ہیں۔ میں نے ان تینوں یونیکچرز کی کمپوزنگ کے بعد انھیں آغا شبیر حسن میشی صاحب کے سامنے رکھا۔ انھوں نے ان یونیکچرز کی اشاعت کا فیصلہ کرنے میں چند سیکنڈ بھی ضائع نہیں کیے اور فرمایا: سید صاحب ان یونیکچرز کی اشاعت کا فوری اہتمام کریں۔ ہمارا ادارہ

ہر طرح سے آپ کے ساتھ ہے۔

قرآن اور سائنس ریسرچ فاؤنڈیشن پاکستان اور زہرا اکیڈمی پاکستان کی یہ کوشش آپ کے
ہاتھ میں ہے۔ توحید مفضل کو سائنسی تشرع کے ساتھ تین الگ الگ کتابوں کی صورت میں شائع کیا
گیا ہے۔ ایک کتاب زیادہ ضخیم ہو جاتی۔ اس کی قیمت بڑھ جاتی اور قارئین کا حلقة محدود ہو جاتا۔ ضخیم
کتابیں لائبریریز کے لیے خریدی جاتی ہیں اور ان لائبریریز سے بہت کم لوگ استفادہ کرتے ہیں۔
میں نے کتابوں کے ایسے بہت سے قبرستان دیکھے ہیں جہاں اعلیٰ درجے کی الماریاں اور کتابیں
دستیاب ہیں اور اس کے ارد گرد رہنے والے کبھی کبھار ہی یہاں سورہ فاتحہ پڑھنے کو آتے ہیں۔ البتہ
ایسی لائبریریوں کے دوسرے فوائد بہر حال موجود ہیں۔

اس خدمت کے سرانجام دینے میں بہت سارے دوستوں نے کسی نہ کسی حد تک میری مدد کی
ہے۔ میں ان تمام دوستوں کا شکرگزار ہوں۔

توحید مفضل کی یہ تین جلدیں پر لیں میں جا رہی ہیں تو اس موقع پر مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے
مولانا ڈاکٹر کلب صادق صاحب میرے ساتھ ہی ہیں۔ میں نے توحید مفضل پر کام آغاز کیا، ہی تھا
کہ محرم الحرام شروع ہو گیا۔ مولانا ڈاکٹر کلب صادق صاحب کراچی تشریف لائے اور حسب
معمول پہلی محرم ہی کو مجھے فون کیا۔

گزشتہ کئی برسوں سے ڈاکٹر صاحب کا یہ معمول رہا ہے کہ اس کم علم کو اسی طرح یاد فرماتے ہیں
اور پھر سارے سال دنیا میں کہیں بھی ہوں، فون کر کے خیریت اور کام کی رفتار کے بارے میں
معلوم کرتے رہتے ہیں۔ مجھے کوئی مشکل ہوتا سے دور کرنے میں دریں ہیں کرتے۔ ڈاکٹر کلب
صادق صاحب ایک مدت سے یہ کوشش کر رہے ہیں پاک و ہند کے تمام دینی مدارس کے لیے
سائنسی موضوعات پر چھوٹی چھوٹی آسان زبان میں لکھی گئی کتابیں تیار کی جائیں۔

گزشتہ سال بھی موضوع گفتگو یہی رہا۔ میں نے اسی دوران ”توحید مفضل“ پر جو کام کیا تھا،
ان کی خدمت میں پیش کیا۔

ڈاکٹر صاحب نے بے حد مصروفیت کے باوجود دادے تفصیل سے پڑھا۔ ان کی خوشی کو میں محسوس کر سکتا تھا۔ انہوں نے گلے لگا کر بہت دعائیں دیں اور میرے سر کے ایک بوجھ کو بھی کم کر دیا جس نے کئی ماہ سے میرے ذہن کو بوجھل کر رکھا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کی توفیقات میں اضافہ فرمائے، انہیں ہمیشہ خوش رکھے اور ان سے ہمیشہ خوش رہے۔

پروفیسر وقار احمد زبیری ز ولو جی کے سینئر اساتذہ میں سے ہیں اور دنیا کی کئی جامعات میں تدریس کے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ توحید مفضل جلد: 2 پر آپ کا تبصرہ قابل مطالعہ اور میرے لیے انتہائی عزت افزائی کا سبب ہے۔ اس کے لیے میں پروفیسر وقار احمد زبیری کا بے حد شکر گزار ہوں۔

پروفیسر بدر الدّجی خان بھی فزکس کے سینئر اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں اور ایک طویل عرصے سے سائنس کے مختلف موضوعات پر مقالات لکھتے رہے ہیں۔ توحید مفضل جلد: 3 پر آپ نے جو تبصرہ فرمایا، اس کے لیے میں پروفیسر صاحب کا احسان مند ہوں۔

ڈاکٹر سید وقار یوسف عظیمی ایک علمی، روحانی خاندان کے فرد اور مہربان دوستوں میں سے ہیں۔ توحید مفضل جلد: 1 میں آپ کا تبصرہ شامل ہے۔ اپنی بے پناہ مصروفیات سے وقت نکال کر انہوں نے توحید مفضل پر جو تبصرہ فرمایا، وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب۔

ڈاکٹر محمد رضا زیدی ادویات کی ایک بین الاقوامی کمپنی میں ریسرچ کے شعبے سے وابستہ ہیں۔ میری اور ڈاکٹر رضا کی دوستی ممتاز کانج خیر پور کے زمانے کی ہے۔ توحید مفضل جلد: 1 پر ان کا تبصرہ میری ہمت افزائی کا سبب بنا۔ تھینک یور رضا۔

سید حسن امام رضوی نے میری تحریر کے حوالے سے جو تبصرہ کیا وہ توحید مفضل جلد: 2 میں آپ پڑھیں گے۔ ان کا اصرار تھا کہ کسی نے اپنے تبصرے میں تمہارا تذکرہ نہیں کیا اس لیے میں صرف تمہارے طرز تحریر پر لکھوں گا۔ حسن امام! بہت شکریہ۔

علّامہ طالب جو ہری صاحب سے نیازمندی کا عرصہ کم و بیش چالیس سال پر محیط ہے۔ لکھنے

پڑھنے کا ذوق طالب جو ہری صاحب کی صحبت ہی میں پروان چڑھا اور میں وہ پہلا آدمی ہوں جس نے علامہ صاحب کی تفسیر قرآن کو سب سے پہلے فیئر کرنے کا آغاز کیا۔ میں علامہ طالب جو ہری صاحب کی گراں قدر رائے کے لیے ان کا بے حد شکر گزار ہوں۔

جامعہ کراچی کے شعبۂ جغرافیہ کے سربراہ پروفیسر جمیل حسن کاظمی صاحب میرے محسنوں میں سے ہیں لیکن بڑی مشکل سے ہاتھ آتے ہیں۔ بہر حال اپنی مصروفیات سے انہوں نے وقت نکالا اور توحید مفضل: 3 پانچ تبصرے سے سرفراز کیا۔ شکریہ پروفیسر جمیل حسن کاظمی صاحب۔

علامہ رضی جعفر نقوی صاحب، عالم و خطیب ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب قلم بھی ہیں۔ فی زمانہ یہ صفات کم ہی یکجا ہوتی ہیں۔ علامہ صاحب نے جس محبت کے ساتھ اس حقیر کی کوششوں کو سراہا اس کے لیے میں ان کا احسان مند ہوں۔

والسلام

جنسِ بازارِ معاصی

محمد علی سید

۱۵ اکتوبر ۲۰۱۱ء

توحید مفضل

حجت الاسلام والمسلمین

علامہ طالب جوہری صاحب قبلہ

اگر فلسفی اسرارِ کائنات میں تجسس کرتے ہوئے براہن، یعنی خالص عقلی دلائل کے ذریعے کسی نتیجے تک پہنچ جائے تو اس کا یہ نتیجہ فلسفہ کھلاتا ہے۔ یعنی فلسفے کا یہ سفر زمین سے آسمان کی طرف صعودی سفر ہے۔ اس کے برعکس دین کا سفر ہبوطی ہے کہ وہ آسمان سے زمین کی طرف بقدر ضرورت، حقائق و معارف کی ترسیل کرتا ہے۔ چونکہ یہ ترسیل حقائق کی دنیا سے ہوتی ہے اس لیے اس میں شک و ریب کی گنجائش نہیں ہوتی۔

زیرِ نظر کتاب امام جعفر صادق علیہ السلام کے اقوال کے ترجمے و تشریح پر مشتمل ہے۔ امام علیہ السلام کے ان اقوال کا شجرہ نسب بھی انہی آسمانی حقائق سے جڑا ہوا ہے جن کا سرچشمہ وجہ والہام ہیں۔ میرے اس دعوے کی دلیل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ فرمان مبارک ہے جس میں صراحةً کی گئی ہے کہ انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ و عترتی۔ یہ حدیث مبارک حوالے سے اس لیے بے نیاز ہے کہ لا تعداد محدثین و روادت نے اس کی تخریج کی ہے۔

زیرِ نظر طویل حدیث عترت رسول کے چھٹے امام، امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے اور اس کے راوی حضرت مفضل بن عمر ہیں۔ مفضل بن عمر کا تذکرہ شیخ طوسی نے اپنے رجال میں امام جعفر صادق و امام مویٰ کاظم علیہما السلام کے اصحاب میں کیا۔ استادِ معظم آیت اللہ العظمیٰ خوئی نے اپنے مجمع الرجال میں تحریر کیا ہے کہ ان کی جلالت قدر کے لیے یہ کافی ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے انھیں اس حدیث کے لیے مخصوص کیا جس کا نام ”حدیث مفضل“ ہے اور نجاشی نے

اس حدیث کو اپنے رجال میں ”کتاب فکر“ کے نام سے یاد کیا ہے۔

^{لعظیم} آیت اللہ علام حوم کے اس بیان سے راوی اور روایت دونوں کی وثاقت آشکار ہے۔
اس حدیث کا تذکرہ حدیث اور رجال کے قدیم مصادر میں اس کثرت سے ہے کہ اس کی وثاقت محتاج تعارف نہیں ہے۔

تین دہائیوں سے زیادہ عرصہ گزر گیا جب میں شمالی ناظم آباد میں سکونت پذیر تھا، ان دنوں محمد علی سید سے میری ملاقاتوں کا تواتر زیادہ اور دورانیہ طویل ہوا کرتا تھا۔ انہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو، میں نے ہی انہیں اس عظیم علمی سرمائے کی طرف متوجہ کیا تھا اور اس کے اردو ترجمے کی اطلاع بھی فراہم کی تھی۔ محمد علی سید اپنی نوجوانی سے ہی علم دوست اور ادب شناس ہیں۔ انہیں شعرو شاعری اور تحریر مددوں سے ہمیشہ عملی دلچسپی رہی ہے۔ اس کا ثبوت ان کی وہ کتابیں ہیں جو آج قارئین کی دست رکی میں ہیں اور بڑی حد تک چونکا دینے والی ہیں اور سب سے بڑھ کر ان کا یہ تحقیقی کام جو انہوں نے توحید مفضل پر سرانجام دیا ہے، انتہائی قابل قدر اور ستائش کے لائق ہے۔

موجودہ کتاب میں انہوں نے اپنی بے چین علمی طبیعت کا سکون تلاش کر لیا ہے اور مجھے امید ہے کہ وہ اپنی زندگی کا بیشتر حصہ انہی فلکری وادیوں کو طے کرنے میں صرف کریں گے۔ میں نے اس کتاب پر اس لیے گفتگو نہیں کی کہ یہ کتاب خود اپنا تعارف ہے۔ البتہ قدیم ترجمے میں زبان اور اسلوب میں تبدیلیاں زمانے کے مطابق اور تشریفات بر محل، مدلل اور دلنشیں ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اس کتاب کو انگریزی زبان میں ترجمہ کر لیا جائے تو اسے بین الاقوامی سائنسی ادب کے مقابلے میں بڑے فخر سے رکھا جا سکتا ہے۔

میں دعا گو ہوں کہ رب العزت بہ طفیل معصومین علیہما السلام، محمد علی سید کو بیش از بیش توفیق عطا فرماتا رہے۔

طالب جوہری

کیم ذی قعده ۱۴۳۳ھ

توحید مفضل

ڈاکٹر وقار یوسف عظیمی

پی ایچ ڈی، کراچی یونیورسٹی

فرزند رسول، حضرت امام جعفر صادق سلام اللہ علیہ (پیدائش 80 ہجری، مدینہ منورہ۔ وصال 148 ہجری، مدینہ منورہ) علم و معرفت کا ایک ایسا سمندر ہیں جو سطح سے لے کر تھہ تک بے شمار خزانوں کا حامل ہے۔ یہ عظیم خزانے نہ صرف امتِ مسلمہ بلکہ پوری نوعِ انسانی کے لیے فیض اور کامیابیوں کا ذریعہ ہیں۔

اب اسے کوتاہ نظری اور ناشکری کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ کچھ لوگوں نے امتِ مسلمہ کی انتہائی عظیم المرتبت اور پوری نوعِ انسانی کے لیے فیض کا منبع، ان ہستیوں کو فقة اور مسلک تک ہی محدود کر دیا ہے۔ ہمیں کوتاہ نظری سے دامن چھڑا کر وسیع النظری اور بصیرت کے ساتھ معرفت کی طرف قدم بڑھانا چاہیے۔

توحید مفضل، حضرت امام جعفر صادق سلام اللہ علیہ کے ان ارشادات کا مجموعہ ہے جو آپ نے اپنے ایک انتہائی لاکھ اور معتمد شاگرد جناب مفضل ابن عمرؓ کے سامنے بیان فرمائے۔ یہ مجموعہ عربی زبان میں ہے۔ ہمارے لیے باعث فخر اور حیران کن حقیقت یہ ہے کہ توحید مفضل نامی یہ جلیل القدر کتاب امام جعفر صادق سلام اللہ علیہ نے اس دور میں مفضل ابن عمرؓ کو لکھوائی جب سائنسی انداز سے سوچنے کا روانج تک نہیں تھا۔ لیکن اس کتاب میں امامؐ نے ان موضوعات پر گفتگو فرمائی جو آپ سے کم و بیش ہزار سال بعد سائنسی علوم کی بنیاد ثابت ہوئے۔ گویا سائنس کی دنیا میں بھی سبقت و فوقيت اولیائے خدا، ہی کو حاصل تھی اور ہے۔

پاکستان کے معروف قلم کار جناب محمد علی سید کو اللہ تعالیٰ نے یہ توفیق عطا فرمائی کہ آپ نے وقت کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے "توحید مفضل" کا سلیس اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اس طرح حضرت امام کے ارشادات اردو داں طبقے تک پہنچانے کا ایک اچھا اہتمام ہو گیا ہے۔ فاضل شارح نے اس کتاب میں متعلقہ موضوعات پر سائنسی تشریحات اور ان کے مستند حوالے بھی شامل کیے ہیں۔ ان تشریحات کی شمولیت سے آج کے تعلیم یافتہ، خصوصاً نوجوان طبقے کے لیے ارشاداتِ عالیہ کو سمجھنا مزید آسان ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ مختلف موضوعات پر ایم فل یا پی ایچ ڈی کرنے والے ریسرچ اسکالرز اور دیگر محققین، مصنفین، دانشور حضرات اور اساتذہ کرام بھی اس سے فائدہ اٹھاسکیں گے۔

اس طالبِ علم کے رائے یہ ہے کہ "توحید مفضل" کے اس ترجمے اور سائنسی تشریح کو امت کے ہر حصے تک پہنچانے کی حتی الامکان سعی کی جانی چاہیے۔ اسکوں، کالج اور یونیورسٹی کی لائبریریز کے ساتھ ساتھ ہر مکتبہ، فکر کے مدارس کی لائبریریز میں بھی اس کتاب کی موجودگی طلباء اور اساتذہ کے لیے بہت مفید ہوگی۔

دعا ہے کہ نبی آخر مدینۃ العلم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، باب العلم حضرت مولا علی کرم اللہ وجہ اور حضرت بی بی فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھرانے کے ایک عظیم رکن حضرت امام جعفر صادق سلام اللہ علیہ کے افکار کی ترویج و اشاعت کی اس کوشش پر اللہ تعالیٰ اپنے بندے محمد علی سید کو بہت اجر عطا فرمائے۔ فروعِ علم کی یہ کوشش ان کے لیے، ان کے بزرگوں کے لیے، ان کی اہلیہ اور اولاد کے لیے اور اس کام میں معاون افراد کے لیے صدقہ جاریہ بن جائے۔ آمین

اس کے ساتھ ہی میں یہ دعا بھی کرتا ہوں کہ امت مسلمہ اپنے عظیم اسلاف کے گراں قدر علمی درثی کا حق سمجھنے اور اسے ادا کرنے کی فکر کی راہ پر گامزن ہو جائے۔ آمین

وقار یوسف عظیمی

توحید مفضل

ڈاکٹر سید محمد رضا زیدی

ریسرچ ڈائریکٹر برٹل اینڈ مارٹر اسکوپ - سنگاپور

توحید مفضل بلاشبہ ایک سائنسی کتاب ہے، جو اثبات وجود خدا کو سمجھانے کے لیے لکھی گئی۔ ہزاروں تقریبیں اور سیکڑوں کتابوں کو پڑھ کر شاید ایک مسلمان صحیح معنوں میں صاحب ایمان یعنی مومن نہ بن پائے لیکن توحید مفضل پڑھنے کے بعد خدا کا انکار کرنے والوں کے لیے بھی ایمان لانا عقلاءً واجب ہو جائے گا۔

میں خود کو ہرگز اس قابل نہیں سمجھتا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے اس کلام بلا غلط پر کوئی تبصرہ کرنے کی جарат کروں البتہ اس علمی خزانے کا ایک حصہ یعنی امام علیہ السلام کا پہلا یکچھر ایناٹومی، فزیالوجی اور انسان کی زندگی کے بعض حیران کن پہلوؤں کا احاطہ متوجہ کرتا ہے۔ اس کے حوالے سے میں قارئین کو بعض حقائق کی طرف ضرور متوجہ کرنا چاہوں گا۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے ۸۳ھ صدی ھجری میں پیدا ہوئے اور ۱۳۸ صدی ھجری میں آپ دنیا سے تشریف لے گئے۔ دوسری صدی ھجری کا یہ زمانہ اسلامی دنیا میں علوم و فنون کے آغاز کا دور تھا۔ اس دور میں دوسری زبانوں سے مختلف علوم کی کتابیں، اسلامی دنیا میں لائی گئیں اور بعد کے ادوار میں ان کے تراجم عربی زبان میں ہوئے۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ نبی امیہ اور بنو عباس کے درمیان اقتدار کی جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ ایمر جنیسی کے حالات میں حکمرانوں کے لیے یہ ممکن نہ رہا کہ اپنی سخت پالیسیوں اور جابرانہ احکامات کو ساری مملکت میں سختی سے برقرار رکھ سکیں۔ اسی لیے دوسری صدی ھجری کے نصف آخر میں آزادی اظہار اور آزادی خیال کا غلبہ زیادہ رہا اور اسی سبب

سے اس زمانے میں خود مسلمانوں میں بہت سے فرقے اور مکاتب فکر وجود میں آئے۔ اس وقت کسی شخص کو مسلمان معاشرے کا فرد ہوتے ہوئے بھی دین کے بنیادی عقائد پر اپنی رائے کا اظہار کرنے میں کوئی خوف نہیں تھا۔ ان عقائد میں سب سے بنیادی اور پہلا عقیدہ کائنات کے خالق کے وجود کو تسلیم کرنا ہے لیکن اس وقت اسلامی دنیا میں ایسے لوگ بھی موجود تھے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی وحدانیت و خالقیت کا کھل کر انکار کرتے تھے اور اکثر مسجد نبوی میں بیٹھ کر اسلامی عقائد کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔

ایسی صورت میں خدا پرستوں کے سامنے دو ہی راستے تھے کہ یا ان دہریوں کو قتل کر دیا جائے اور یا عقل و علم کے ذریعے انہیں ہدایت کی راہ دکھائی جائے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ اثبات وجود خدا کے دائل کے ذیل میں امام علیہ السلام نے سب سے پہلے خود انسان کے وجود، اس کے جسم، اس کے اعضاء اور ان اعضاء کے درمیان ہم آہنگی کے ذریعے، اس انسان، اس کے وجود اس کے اعضاء و جوارح اور جسم سے باہر کی دنیا میں موجود اشیاء اور جسم انسانی سے ان کی ہم آہنگی کو خالق کائنات کے وجود کی دلیل کے طور پر بیان کیا۔

اس ساری گفتگو کے دوران بیشتر سوال بھی امام علیہ السلام نے پیدا کیے اور ان کے جواب بھی آپ ہی نے جناب مفضل ابن عمر کو تعلیم فرمائے اور اس طرح دوسری صدی ہجری میں علم حیاتیات، علم تشریح ااعضاء اور علم فعلیات جیسے علوم پہلی پہلی بار پوری وضاحت اور صراحة کے ساتھ وجود میں آنا شروع ہو گئے۔

آپ سوچیں گے کہ ان علوم کے بارے میں تو یونان کے فلسفی بھی بہت کچھ جانتے تھے۔ یہ بات بہت حد تک درست ہے۔ لیکن علم حیاتیات کے بارے میں اگر ارسطو کے نظریات کو دیکھا جائے تو وہ آج خاصے مضنکہ خیز معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً اس کا خیال تھا کہ چوبے گو بر سے پیدا ہوتے ہیں اور مکھیاں سڑے ہوئے گوشت سے۔

علم الابدان کے بارے میں جو کچھ مثلاً مثانے کے کھلنے اور بند ہونے والے پٹھوں کے

بارے میں جو انکشاف امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمائے، کیا ارسٹوا اور اس کے دو ہزار سال بعد آنے والے سائنسدان اس کے بارے میں کچھ جانتے تھے؟

کیا انسانوں کی مختلف شکلوں اور جانوروں کی یکساں صورتوں کے بارے میں یونان کے فلاسفیوں سے لے کر انیسویں صدی عیسوی کے سائنسدان کچھ جانتے تھے؟

کیا انسانی بچے کے کم عقل و شعور کے ساتھ پیدا ہونے کی اسباب اور اس کی حکمتوں پر کوئی یونانی فلسفی اور مغرب کا سائنسدان بیسویں صدی عیسوی تک غور و فکر کر سکتا تھا؟

کیا کسی یونانی فلسفی، یا مغرب کے کسی ماہر طبیعت کو یہ بات معلوم تھی کہ آنکھ اور اشیاء اور کان اور آوازوں کے درمیان کچھ اور بھی چیزیں ہیں جن کے بغیر آنکھ اشیاء کا ادراک کرنے اور کان آوازیں سننے سے محروم رہتے؟

میں امام جعفر صادق علیہ السلام نے اس پہلے یہ پھر سے اس طرح کی سیکڑوں مثالیں پیش کر سکتا ہوں لیکن اس کے لیے ایک پوری کتاب لکھی جاسکتی ہے اور خوشی کی بات یہ ہے کہ یہ کتاب محمد علی سید نے لکھ دی ہے اور اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے۔

محمد علی سید میرے بچپن کے دوستوں میں سے ہیں۔ ہم ایک ساتھ پلے بڑھے۔ ممتاز کالج خیر پور میں بھی ہم نے ساتھ تعلیم حاصل کی اور آج تک ساتھ ہیں۔ کالج کے زمانے میں محمد علی سید کا زیادہ وقت شرراتوں میں گزرتا تھا۔ فرست ایئر سائنس میں فیل ہو کر کراچی آئے اور بغیر کچھ پڑھے BA کر لیا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا..... انہوں نے سائنس کہاں پڑھی کہ آج سائنس کے انتہائی مشکل موضوعات پر ان کی کم از کم چار عام فہم کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور ان کے مختلف ایڈیشن شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کی ہر کتاب ایک عجوبہ ہے اور ہر کتاب پڑھنے والے کو اپنے خالق و مالک ہی کی طرف متوجہ کرتی ہے۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ جو علمی تحریریں محمد علی سید کے قلم سے ظاہر ہوئی ہیں، اس معیار کی کتاب لکھنا سائنس کے بہت سے شعبوں کے ماہرین کے لیے بھی ممکن نہیں ہے۔ اس تیرے یہ پھر کی

سائنسی تشریح جس آسانی اور اسناد کے ساتھ محمد علی سید نے پیش کی ہے۔ میں یہ ساری زندگی یہ سب کچھ پڑھتا پڑھاتا رہا ہوں، لیکن میرے لیے ممکن نہیں کہ کلام امام کی اتنی آسانی کے ساتھ تشریح بیان کر سکوں۔

محمد علی سید تمہارے دماغ میں یقیناً کچھ خاص سیل (Cell) آن کر دیے گئے ہیں جو غور و فکر نہ کرنے والے انسانوں کے دماغ میں عام طور پر خوابیدگی کی حالت میں رہتے ہیں۔

سید محمد رضا زیدی

سنگاپور

اس حدیث کے راوی

جناب مفضل ابن عمر جعفی خدمات و منزلت

یہ حدیث مبارک جو امام جعفرؑ کی زبان مبارک سے صادر ہوئی، توحید کے موضوع پر ایک طولانی روایت ہے۔ اس کے راوی مفضل ابن عمر جعفی کوئی ہیں۔ یہ حدیث اسی سبب سے توحید مفضل کے نام سے مشہور ہے۔ اس حدیث کا فارسی، فرانسیسی، انگریزی اور اردو زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

”جناب مفضل ابن عمر، امام جعفر صادق“ کے نہایت ممتاز شاگرد ہیں۔ جناب مفضل ابن عمر کا تعلق جعفی قبیلے سے تھا اور آپ کوفہ کے رہنے والے تھے۔ اسی لیے آپ مفضل ابن عمر جعفی کوئی کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ اپنے وقت کے نامور دانشمند اور بہت ہی بافضلیت و باکمال شخصیت تھے۔

آپ نے امام جعفر صادق علیہ السلام اور امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے مکتب علمی سے درس معرفت حاصل کیا۔ بعض روایات کے مطابق انہوں نے امام محمد باقر علیہ السلام کی علمی محفل سے بھی فیض حاصل کیا تھا۔ جناب مفضل، امام جعفر صادق علیہ السلام اور امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے معتبر اور قابل بھروسہ اصحاب میں شامل تھے۔ دونوں اماموں کے نزدیک انھیں خاص الخاص مقام حاصل تھا۔ (حوالہ: قاموس الرجال: جلد ۹ صفحہ ۹۳-۱۰۱)

مفضل ابن عمر کی منزلت کو سمجھنے کے لیے یہ بات ہی کافی ہے کہ آپ امام جعفر صادقؑ اور امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے اموال وصول کرنے اور خرچ کرنے میں دونوں اماموں کے وکیل تھے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: ”مفضل! جب تم دیکھو کہ ہمارے دو شیعوں کے درمیان مال پر اختلاف ہوا ہے تو ہمارے مال سے رقم ادا کر کے یہ جھگڑا ختم کر سکتے ہو۔“ (حوالہ: مفضل۔ امین امام)

مفضل ابن عمر پہلی صدی ہجری کی آخری دہائی میں پیدا ہوئے۔ آپ نے 80 سال کی عمر

پائی اور سن دو ہجری میں انتقال فرمایا۔ آپ کی جو تالیفات ہم تک پہنچی ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ توحید مفضل ۲۔ کتاب الوصیہ ۳۔ کتاب الیوم والیلة ۴۔ علَّم الشرائع ۵۔ کتاب اہلیج (یعنی ہڑ)۔ یہ کتاب ”حدیث ہلیلہ“ کے نام سے معروف ہے۔

جناب شیخ طوسیؒ نے اپنی ”رجال“ اور شیخ مفید علیہ الرحمۃ نے اپنی کتاب ”ارشاد“ میں جناب مفضل ابن عمرؓ کو امام جعفر صادقؑ کے عظیم اور مورِ داطینان اصحاب میں شمار کیا ہے۔

ہشام ابن احمد سے روایت ہے۔ ”میں ایک دن امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میرے ذہن میں خیال تھا کہ میں حضرتؐ سے مفضل ابن عمرؓ کے بارے میں سوال کروں گا، لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: ”خدا کی قسم مفضل ابن عمر جعفی ایک عظیم اور نیک انسان ہے۔“ امام جعفر صادق علیہ السلام نے اس جملے کو تیس سے زیادہ مرتبہ دہرا�ا اور پھر کہا۔ ”اس کے گھروالے بھی ایسے ہی ہیں۔“

(حوالہ: البخار الانوار۔ جلد ۵ صفحہ ۳۲۰)

عبداللہ بن فضل ہاشمی روایت کرتے ہیں۔ ”میں ایک مرتبہ امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر تھا کہ مفضل ابن عمرؓ ہاں داخل ہوئے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کی نظر جیسے ہی ان پر پڑی تو آپ نے فرمایا: ”مفضل! خدا کی قسم میں تمہیں دوست رکھتا ہوں اور تمہارے دوستوں کو بھی دوست رکھتا ہوں۔“ اس کے بعد آپ نے فرمایا: ”اگر میرے تمام اصحاب وہ معرفت رکھتے جو تم رکھتے ہو تو کبھی بھی دو افراد میں اختلاف نہ ہوتا۔“

مفضل ابن عمرؓ نے عاجزی سے عرض کیا: ”فرزند رسول! میرا خیال ہے آپ نے میرا مرتبہ زیادہ بلند کر دیا ہے۔“

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: ”ایسا نہیں ہے۔ میں نے تو تمہیں وہی مقام دیا ہے جس مقام پر اللہ تعالیٰ نے تمہیں قرار دیا ہے۔“ (حوالہ: البخار الانوار۔ جلد ۵ صفحہ ۳۹۵)

یہ تھا جناب مفضل ابن عمرؓ کی شخصیت کا ایک سرسری ساجائزہ۔ جو حضرات جناب مفضلؓ کی

شخصیت، خدمات اور ان کے مقام و منزلت کے بارے میں تفصیل جاننا چاہیں وہ درج ذیل ویب سائٹ سے استفادہ کر سکتے ہیں۔
1-www.raban.ir 2-www.andishaqom.org

عجیب بات یہ ہے کہ علم رجال کے ماہرین کے ایک گروہ نے جناب مفضل ابن عمرؓ کی درخشاں شخصیت کو بہ وجہ دھندا نے کی کوشش کی۔ جناب مفضلؓ کی شخصیت کو تنازعہ بنانے کے پیچھے وہی سوچ کا فرماء ہی کہ راوی کو مشکوک بنادیا جائے تو اس سے مردی علوم آل محمدؐ کے بارے میں شک و شبہ پیدا کرنا مشکل نہیں ہوگا۔ لیکن اس کوشش میں خاک اڑانے والوں کے اپنے چہرے خاک آ لو دھو گئے اور مفضل ابن عمرؓ کی شخصیت علوم آل محمدؐ کے نور سے مزید جگم گا اٹھی۔

ہمارے اس دعوے کی دلیل وہ کلام ہے جو مفضل ابن عمرؓ نے امام علیہ السلام سے نقل کیا اور جسے آپ آئندہ صفحات پر ملاحظہ کریں گے۔

اب آپ سوال کر سکتے ہیں کہ جناب مفضل ابن عمرؓ کی شخصیت سے یہ محاربانہ روایہ کیوں روا رکھا گیا؟ اس کا سبب وہ روایتی، وراثتی، مسلمان عابدو زادہ تھے جو ظاہری عبادات ہی کو مقصد زندگی سمجھتے تھے۔ ان کے مقابلے میں مفضل ابن عمرؓ جیسا تو حید پرست تھا جو فرائض کی بجا آوری اور ظاہری عبادات سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ آثار کائنات میں غور و فکر بھی کرتا تھا۔

وہی غور و فکر جس کی دعوت قرآن مجید کی متعدد آیات میں موجود ہے۔ ”جو لوگ اٹھتے بلیختے، کروٹ لیتے (غرض ہر حال میں) اللہ کا ذکر کرتے ہیں اور آسمان وزمین کی بناؤٹ پر غور و فکر کرتے ہیں اور (بے ساختہ) کہتے ہیں کہ اے اللہ (بے شک) تو نے یہ سب کچھ بے سبب پیدا نہیں کیا۔ تو پاک و پاکیزہ ہے۔ سورہ آل عمران آیت: ۱۹۱“

احادیث کی کتابیں اس غور و فکر کی دعوت سے بھری ہوئی ہیں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”ایک ساعت کا غور و فکر، ستر سال کی عبادت سے افضل ہے۔“

ایک اور مقام پر آپؐ نے ارشاد فرمایا: ”جب ایک عابد جنت کے دروازے پر پہنچے گا تو فرشتے اسے خوش آمدید کہیں گے اور اسے جنت میں لے جایا جائے گا۔ لیکن جب ایک عالم جنت کے

دروازے پر پہنچ گا تو اسے روک لیا جائے گا۔ وہ سوال کرے گا کہ مجھے کیوں روکا گیا؟ تو فرشتے کہیں گے ”آپ کو اس لیے روکا گیا ہے کہ آپ جتنے آدمیوں کی چاہیں شفاعت کریں اور انھیں اپنے ساتھ جنت میں لے جائیں۔“ (حوالہ: نجح الفصاحت۔ تالیف: ابوالقاسم پائیندہ)

امیر المؤمنین علیہ السلام نے فرمایا: ”نہ تو انہوں نے ان (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے انوارِ حکمت سے ضیاء حاصل کی اور نہ روشن علوم کے چقماق کو گڑ کر نورانی شعلے پیدا کیے۔ یہ تو بس اس معاملے میں چوپائیوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی بدتر“ (حوالہ: نجح البلاغہ)

حضرت امام علی رضا علیہ السلام نے فرمایا: ”عبادت یہ نہیں ہے کہ کھڑے ہو کر (طویل) نماز پڑھی جائے یا (لبے لبے) سجدے کیے جائیں بلکہ عبادت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تخلیقات پر فکر و تدبیر کیا جائے“۔ (حوالہ: اصول کافی)

جناب مفضل ابن عمرؓ اسی غور و فکر کے عادی تھے۔ اسی لیے ان کے ذہن میں کب، کیوں، کیسے جیسے سوال پیدا ہوتے تھے۔ انھی سوالوں کے جواب حاصل کرنے کے لیے وہ امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور اپنے علم و عمل اور دیگر خوبیوں کے ساتھ ساتھ خاص طور پر شاید انھی سوالوں کے سبب وہ امام جعفر صادق علیہ السلام کو زیادہ عزیز تھے اور شاید اسی لیے اس زمانے کے بعض زادہ عابد بزرگ اور ظاہرین افراد کے باطن میں مفضل ابن عمرؓ جیسے نوجوان کے لیے وہ کیفیت پیدا ہوئی جسے حسد سے قریب تر کہا جاسکتا ہے۔ شاید یہی سبب رہا ہو کہ مفضل ابن عمرؓ جیسے خدا پرست کے ساتھ ان کا رویہ بیشتر معاندانہ ہی رہا۔

ایسا کل بھی ہو رہا تھا، آج بھی ہو رہا ہے اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔ لیکن مفضل ابن عمرؓ کل بھی علم حاصل کرنے اور اسے پھیلانے میں مصروف تھے، آج بھی کہیں نہ کہیں مصروف عمل ہیں اور آنے والے زمانوں میں بھی مصروف عمل رہیں گے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کی گفتگو کا پس منظر

مفضل ابن عمرؓ کی زبانی

محمد بن سنانؓ روایت کرتے ہیں کہ مجھ سے مفضل ابن عمرؓ نے بیان کیا:

”میں ایک روز نمازِ عصر کے بعد مسجد نبوی میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روپے کے قریب قبر مبارک اور منبر کے درمیان بیٹھا تھا اور اس بات پر غور کر رہا تھا کہ پور دگارِ عالم نے ہمارے سید و سردار حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کیا کیا شرف اور فضائل عطا فرمائے، جنہیں امت کے تمام لوگ نہیں جانتے اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے مقاصد سے لا علم ہیں۔ زیادہ تر لوگ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فضل و کمال، منزلت و مراتب اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بلند ترین مراتب سے آج بھی ناواقف ہیں۔“

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک دھریہ جس کا نام ابن ابی العوجا تھا، مسجد نبوی میں داخل ہوا اور مجھ سے ذرا فاصلے پر آ کر بیٹھ گیا۔ ذرا دیر گزری تھی کہ اس کے ساتھیوں (اور ہم خیال لوگوں) میں سے ایک اور شخص مسجد نبوی میں داخل ہوا اور ابن ابی العوجا کے قریب ہی آ کر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں آپس میں باتیں کرنے لگے۔ گفتگو کا آغاز ابن ابی العوجا نے کیا اور قبر مطہر کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہنے لگا۔ ”اس صاحب قبر نے بڑی عزت پائی۔ شرف و بزرگی کے تمام حصے اس نے حاصل کر لیے اور تمام حالات میں اس نے بڑا مرتبہ پایا۔“

اس کا ساتھی بولا۔ ”ہاں وہ (محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک فلسفی آدمی تھا۔ اس نے بڑے مرتبے کا دعویٰ کیا اور اس دعوے پر وہ مجزے لایا۔ جنہوں نے عام عقولوں کو حیران کر دیا۔ عقل مندوں نے انہیں سمجھنے کے لیے فکر کے دریاؤں میں غوطے لگائے مگر ناکام ہی رہے۔ پھر جب

عقلاء، فصحاء اور خطباء نے اس کی دعوت کو قبول کر لیا تو تمام لوگ فوج در فوج اس کے دین میں داخل ہونے لگے۔ جن جن شہروں تک اس کی دعوت پہنچی وہاں وہاں کے عبادت خانوں اور مسجدوں میں ناموس اکبر (یعنی خداۓ تعالیٰ) کے نام کے ساتھ اس کا نام بھی شامل ہو گیا اور بلند آواز سے پکارا جانے لگا۔ اس میں خشکی کی تخصیص ہے نہ دریا کی، نہ پہاڑی ملکوں کی اور نہ ہموار ملکوں کی۔ یہ بلند آواز سے پکارا جانا بھی صرف ایک مرتبہ نہیں بلکہ ہر شب و روز میں پانچ پانچ مرتبہ۔ اذان و اقامت میں اپنا نام خدا کے نام کے ساتھ اس نے صرف اس لیے ملا یا کہ ہر وقت اس کی یادتازہ ہوتی رہے اور اس کے کام میں خلل اور کمزوری پیدا نہ ہو۔“

ابن ابی العوجا بولا۔ ”محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ذکر کو چھوڑو۔ اس کے معاملے میں تو میری بھی عقل حیران ہے اور میری فکر کو راستہ نہیں ملتا۔ اب اس پر سوچو کہ کس وجہ سے لوگ جو ق در جو ق محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین میں داخل ہو رہے ہیں؟ یعنی ”پروردگار عالم“ کے بارے میں بتاؤ کہ آخر وہ بھی کوئی چیز ہے کہ نہیں؟“

مفضل ابن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ اس کے بعد ابن ابی العوجا نے اشیائے عالم کی ابتداء پر بات کرنا شروع کی اور کہنے لگا کہ یہ سب چیزیں کس طرح بنیں۔ اس نے اس بات پر بھی خاص زور دیا کہ یہ سب چیزیں کسی نے نہیں بنائیں۔ ان کا کوئی بنانے والا اور مدبر و مصلح نہیں بلکہ یہ خود بہ خود پیدا ہو جاتی ہیں۔ ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ یہ دنیا اسی طرح چلتی آئی ہے اور اسی طرح چلتی رہے گی۔

مفضل ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ ان (یعنی ابن ابی العوجا وغیرہ) کی یہ گستاخانہ گفتگوں کر میں اپنے غصے پر قابو نہ رکھ سکا۔ میں نے ان کو ڈانٹا اور کہا۔ ”اللہ کے دشمنو! اللہ کے دین کا انکار کرتے ہو؟ تم اس ذاتِ خالق کا انکار کرتے ہو جس نے تمھیں اس اچھی صورت پر پیدا کیا اور تمہارا بنیہ قرار دیا (یعنی تمہیں بہترین ساخت پر پیدا کیا) اور تمھیں ایک حال سے دوسرے حال میں منتقل کرتا رہا (یعنی تم نہیں تھے اور پھر ہو گئے۔ پھر بچے سے جوان ہوئے) یہاں تک کہ تم اس حالت

میں پہنچے۔ اگر تم اپنے نفس (وجود) ہی پر غور کرتے اور تمہارا نفیس حالتہ (یعنی عقل اور ذہن) تمہارے ساتھ صداقت بر تاتو اللہ کی ربو بیت کے آثار اور اس کی خلائقیت و صناعتیت کے دلائل تمہیں اپنے نفس ہی میں موجود نظر آتے اور اس طرح اللہ تعالیٰ کے وجود کے شواہد و براہین تم پر واضح ہو جاتے۔“

ابن الی العوجانے نے بڑے سکون سے جواب دیا۔ ”مفضل! دیکھو اگر تم میں اس موضوع پر تفصیل سے بات کرنے کی صلاحیت ہے تو ہم سے بات کرو۔ اگر تمہارے پاس خدا کے ہونے کی کوئی مستحکم دلیل ہوئی تو ہم اسے ضرور مان لیں گے اور اگر تم اہل کلام میں سے نہیں ہو تو اس موضوع پر بولنے کا تمہیں کوئی حق نہیں ہے۔

(جیسا کہ ہم جانتے ہیں) تم اگر جعفر صادق کے اصحاب میں سے ہو تو مفضل، ان کا طرز کلام تو ایسا نہیں ہے جیسی گفتگو تم نے کی ہے، ایسی گفتگو وہ نہیں کرتے اور نہ اس طرح کی دلیل پر ہم سے بحث کرتے ہیں۔ انہوں نے ہماری (اس طرح کی) باتیں اس سے بھی زیادہ سنی ہیں جو تم نے سنی ہیں لیکن نہ انہوں نے کبھی غصہ کیا اور نہ جواب دینے میں یہ لب و لہجہ اختیار کیا۔ وہ تو بہت ہی بردبار، باوقار، دانشمند اور پختہ عقل کے انسان ہیں۔ نہ کبھی غصہ کرتے ہیں اور نہ سختی۔ وہ ہماری باتیں بڑی توجہ سے سنتے ہیں اور ہم سے ہمارے عقیدے کے حوالے سے مزید دلائل معلوم کرتے ہیں۔

یہاں تک کہ جب ہم اپنے دلائل مکمل کر لیتے ہیں اور ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ ہم نے انھیں لا جواب کر دیا تو عین اسی وقت وہ ہماری طویل دلیلوں کو اپنے ایک مختصر سے جملے اور ایک چھوٹی سی دلیل کے ذریعے باطل کر دیتے ہیں۔ ہم پران کی جست قائم ہو جاتی ہے۔ وہ ہمارے عذر کو قطع کر دیتے ہیں۔ ہم ان کی مختصری دلیل کا جواب دینے سے بھی خود کو معدود اور بے بس پاتے ہیں۔ ہم ان کے جواب کو رد نہیں کر سکتے (اور ان کا منہ تکتے رہ جاتے ہیں)۔ تو مفضل اگر تم ان کے اصحاب میں سے ہو تو اس طرح بات کرو، (ور نہ اپنی راہ لو۔)

مفضل ابن عمر بیان کرتے ہیں کہ ان کی باتیں سن کر میں مسجد نبوی سے بہت غم زده اور فکر

مند باہر نکلا کہ دین اسلام اور اہل اسلام اس فرقے (یعنی خدا کو نہ ماننے والوں) کی وجہ سے کیسی مصیبت میں مبتلا ہیں۔ یہ (عجیب) لوگ ہیں کہ اللہ ہی کو نہیں مانتے اور کہتے ہیں کہ سب کچھ خود بہ خود ہی پیدا ہو گیا ہے۔

میں اسی حالت میں اپنے آقا صلوٰۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے مجھے اس شکستہ حال میں دیکھا تو فرمایا: ”کیا ہوا مفضل؟“ (خیریت تو ہے) مفضل کہتے ہیں کہ میں نے ان دہریوں کی جواباتیں سنی تھیں اور جس جس دلیل سے ان کے کلام کو روکیا تھا، وہ سب تفصیل آقا صلوٰۃ اللہ علیہ کے سامنے بیان کر دی۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے میری باتیں سن کر مجھ سے فرمایا: (مفضل تم فکر نہ کرو) ”میں تمہیں باری تعالیٰ جل جل عز اسمہ کی وہ حکمتیں بتاؤں گا جو تمام عالم اور درندوں، چوپائیوں، پرندوں، کیڑے مکوڑوں اور ہر قسم کے جانداروں خواہ وہ حیوان ہوں یا نباتات، پھل دار درختوں، عام پیڑ پوڈوں، غذا میں استعمال ہونے والی سبزیوں اور دوسرے نباتات میں موجود ہیں۔ میں تمہیں اثبات وجودِ خدا پر ایسے مستحکم دلائل کی تعلیم دوں گا اور ایسی باتیں بتاؤں گا جس سے عبرت حاصل کرنے والے سبق حاصل کر سکیں۔ ایمان والوں کے دلوں کو اطمینان قلب حاصل ہو اور اللہ کا انکار کرنے والے حیران و ششدر رہ جائیں۔ تم کل صحیح سوریے میرے پاس آ جانا۔“

مفضل ابن عمر بیان کرتے ہیں کہ یہ سن کر (میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا) میں نہایت خوش و خرم امام علیہ السلام کی خدمت سے واپس آیا (میرے لیے صحیح کا انتظار کرنا مشکل ہو رہا تھا) مجھے وہ رات بہت طوالی محسوس ہوئی۔ رات بھر بے تاب رہا کہ صحیح ہو اور میں وہ دلائل و معلومات امام علیہ السلام سے حاصل کروں، جن کا حضرت نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے۔

صحیح ہوئی تو میں درِ دولت پر حاضر ہوا۔ باریابی کی اجازت ملنے کے بعد میں زیارت سے مشرف ہوا اور بادب کھڑا رہا۔ آپ نے مجھے بیٹھ جانے کا حکم دیا تو میں مودب ہو کر بیٹھ گیا۔

پھر امام جعفر صادق علیہ السلام اپنی جگہ سے اٹھے اور اس کمرے کی طرف بڑھے جہاں اکثر

تلخیہ فرمایا کرتے تھے۔ میں بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ آپ نے فرمایا: ”آ جاؤ.....“ میں آپ کے پیچھے پیچھے چلا۔ آپ اس مخصوص کمرے میں داخل ہوئے اور وہاں تشریف فرمائے ہوئے اور مجھے بیٹھنے کا اشارہ فرمایا۔ میں دوز انو ہو کر آپ کے سامنے بیٹھ گیا۔ آپ نے میرے چہرے کی طرف دیکھا اور فرمایا: ”گویا میں دیکھ رہا ہوں انتظار کے سب گز شتر رات تمہیں بہت طولانی معلوم ہوئی!“

میں نے عرض کی۔ ”جی آقا ایسا ہی ہے۔“



کلام الامام، امام الکلام

پہلے دن امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے اس مجzenama کلام کا آغاز فرمایا جسے قارئین اس کتاب کے آئینہ صفحات پر ملاحظہ فرمائیں گے۔

واضح رہے کہ مفضل ابن عمر، امام جعفر صادق علیہ السلام کی اجازت سے مسلسل چار دن تک امام علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے اور اس علم لدنی سے فیض یاب ہوتے رہے جس کے سامنے دنیا والوں کا علم اور دلائل را کھکھ کے ایک ذرے سے بھی زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔

ان تین علمی نشتوں میں سے پہلی نشست میں امام علیہ السلام نے جو کچھ فرمایا، وہ اس کتاب میں شامل ہے۔ یہ کتاب امام جعفر صادق علیہ السلام کے پہلے یکچھرا اور اس کی سائنسی تشریح پر مشتمل ہے۔ باقی دو یکچھراز جو بالترتیب علم الحیوانات اور زمین و آسمان میں موجود اللہ تعالیٰ کی نشانیوں سے متعلق ہیں قرآن اینڈ سائنس ریسرچ فاؤنڈیشن پاکستان کے زیر اہتمام دوالگ کتابوں کی شکل میں اس جلد کے ساتھ ہی شائع کیے جا رہے ہیں۔

واضح رہے کہ ان یکچھراز میں جن علوم کا تذکرہ اور ان کی وضاحت پیش کی گئی اس کے بارے میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے صدیوں پہلے اور صدیوں بعد بھی اس کرہ ارض پر کسی علمی معاشرے، کسی فلسفی، کسی حکیم اور کسی ماہر حیاتیات کو کچھ معلوم نہیں تھا۔

مقامِ شکر میں اعضاء کا تذکرہ

پور دگار! میں اپنے ایمان کی حقیقت، اپنے یقینِ محکم، خالص اور واضح توحید، ضمیر کے پوشیدہ اسرار، نورِ بصارت کی گزرگاہوں، صفحہ پیشانی کے خطوط، سانس کے گزرنے کے شگاف، قوتِ شامہ کے خزانوں، قوتِ ساعت تک آواز پہنچنے کے سوراخوں، ہونٹوں کے اندر دبے ہوئے رموز، زبان کی حرکت سے نکلے ہوئے الفاظ، منہ کے اوپر اور نیچے کے جبڑوں کے ارتباط کی جگہوں، داڑھ کے اُگنے کے مقامات، کھانے پینے کی سہولت کے راستے، کائنہ سر کو سنبھالنے والے استخوان، گردن کے اعصاب کے ارتباط کی سہولتوں، سینے کی فضاؤں، گردن کے رشتہوں کو سنبھالنے والے اعصاب، قلب کے پردے کو روکنے والے ڈورے، جگر کے ٹکڑوں کو جمع کرنے والے اجزاء، پہلو، جوڑ بند، قوائے عمل، اطرافِ انگشت کے محتویات و مشتملات، گوشت، خون، بال کحال، اعصاب، شریانوں، استخوان، مغز، رگوں، جوارح اور دورانِ رضاعت و شیرخواری مرتب ہونے والے اجزاء، بدن اور زمین نے جو میرے وجود کا باراٹھار کھا ہے اور نیندو بیداری، حرکات و سکنات، رکوع و وجود..... سب کے حوالے سے اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ اگر میں ارادہ بھی کروں اور کوشش بھی کروں کہ آخر زمانہ تک زندہ رہ کر تیری کسی ایک نعمت کا شکریہ ادا کر سکوں تو یہ ناممکن ہے مگر یہ کہ تیرا احسان بھی شامل حال ہو جائے، مگر وہ خود بھی تو ایک مزید شکریہ کا طلب گار ہے!

از: امام حسین علیہ السلام

اقتباس: دعائے عرفہ ۵۸ ھجری

بَابٌ: 1

ہم اللہ کی حمد بیان کرتے ہیں

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

”دیکھو مفضل! اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے موجود تھا۔ اس سے پہلے کوئی چیز نہیں تھی۔ اس کی ذات ہمیشہ باقی رہے گی۔ اس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ ہم اس کی حمد بیان کرتے ہیں کہ اس نے ہمیں (حقائق کا) الہام کیا اور ہم اسی کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے ہمیں (کائنات کے) اعلیٰ علوم عطا فرمائے اور بلند مراتب کے ساتھ ہمیں اپنی مخلوق پر فضیلت عطا کی اور اپنی حکمتیں دے کر ہمیں ان پر امین مقرر کیا۔“

امام گفتگو فرمارہے تھے اور مفضل بن عمر امام کی گفتگو کو قلم بند کرتے جا رہے تھے۔

محدود عقل

ان ابتدائی کلمات کے بعد امام جعفر صادق نے فرمایا:

”جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کائنات کا کوئی پیدا کرنے والا نہیں ہے اور یہ سب کچھ جوز میں اور آسمان میں ہے خود بے خود پیدا ہو گیا ہے تو دراصل یہ ان کی محدود عقل کا قصور ہے جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔

یہ لوگ اپنی کم علمی و کم عقلی کی وجہ سے مخلوقات کی پیدائش میں اور ایک مخلوق سے دوسری مخلوق کے درمیان موجود رشتہ کو سمجھنے سے معذور ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی اس حکمت اور صنعت (ٹیکنالوجی) کو بھی نہیں سمجھ پاتے جو اللہ تعالیٰ نے صحراؤں، میدانوں، سبزہ زاروں، سمندروں، دریاؤں اور پہاڑوں، ہموار اور ناہموار زمینوں میں پیدا ہونے والی طرح طرح کی مخلوقات، انسانوں، حیوانوں، پیڑپوادوں، ننھے ننھے کیڑوں، معدنیات، جڑی بوٹیوں، ہواویں، فضاویں، بارشوں، سورج کے طلوع و غروب ہونے، چاند اور ستاروں کے حرکت کرنے میں (صرف کر) رکھی ہیں۔

ان کی عظمت، اہمیت اور قدر و قیمت کو توفیق الہی حاصل ہونے کی صورت میں صرف صاحبانِ عقل و علم ہی سمجھ سکتے ہیں۔ کفار جنہیں قرآن میں جانوروں سے بھی بدتر کہا گیا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کو سمجھنے سے قاصر ہیں، اسی طرح جس طرح جانور صرف آج میں زندہ رہتا ہے۔ اسے اپنے کھانے پینے، افزائشِ نسل کرنے اور بھاگنے دوڑنے کے سوا کوئی کام نہیں ہوتا۔

یہ جانور بھی اللہ ہی کے بنائے ہوئے نظام کے مطابق ذمہ داریاں پوری کرتے ہیں لیکن وہ مکلف نہیں کہ اللہ کی نشانیوں اور

اس کی خلقت کے نظام پر غور کریں (اور نہ انھیں اس کی عقل دی گئی ہے)۔

اللہ کا انکار کرنے والوں کی مثال ان جانوروں سے بھی بدتر ہے۔ اللہ نے انہیں آنکھیں دی ہیں مگر دیکھتے نہیں، کان دیے ہیں مگر سنتے نہیں، عقل و شعور عطا کیا ہے لیکن یہ اس عقل و شعور سے بس اتنا ہی کام لیتے ہیں جس قدر جانور اپنی محدود عقل سے لے سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام باتوں سے برتر ہے جسے یہ بیان کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ انہیں قتل کرے یہ کہاں بھکے چلے جا رہے ہیں!

ناپینا افراد کی مثال

”در اصل معاملہ یہ ہے کہ ان لوگوں کی مثال ان ناپینا افراد کی سی ہے جو کسی انتہائی خوب صورت، کشادہ، تمام آسانیوں سے مزین گھر میں داخل ہو گئے ہوں۔ اس گھر میں قالین بچے ہیں، چھتوں پر فانوس لٹک رہے ہیں، کمروں میں بہترین اور خوب صورت ساز و سامان موجود ہے۔ مختلف مقامات پر شمعیں روشن ہیں۔ ایک وسیع دسترخوان پر طرح طرح کے تازہ اور مزے دار کھانے بجے ہوئے ہیں۔ گھر میں ہر موقع کی مناسبت سے پہنچے جانے والے ملبوسات بھی موجود ہیں۔ غرض اس عالی شان گھر میں ضرورت کی ہر چیز و افر مقدار میں اپنی اپنی جگہ رکھی ہے۔“

نابینا افراد کا ہاتھ تھامنے والا کوئی نہ ہو؟

جب یہ نابینا افراد، اس گھر میں داخل ہوں اور کوئی ان کا ہاتھ تھامنے والا نہیں راستہ بتانے والا، نہیں ان کی جگہ پر بٹھانے والا وہاں موجود نہ ہو تو وہ نابینا افراد کبھی ایک چیز سے ٹکرائیں گے کبھی دوسری چیز سے ٹھوکر کھائیں گے۔ کبھی کچھ توڑیں گے، کبھی خود زخمی ہوں گے۔ یہ بس دائیں باعثیں ہاتھ چلاتے رہیں گے اور سمجھ ہی نہیں پائیں گے کہ کس چیز کی کیا اہمیت ہے، اسے یہاں کیوں رکھا گیا ہے، یہ کس طرح بنی ہے، کس کام آتی ہے، کس طرح استعمال کی جاتی ہے، اس چیز کے یہاں رکھے جانے کے کیا فائدے ہیں۔ وہ نابینا افراد ان چیزوں سے ٹکراتے رہیں گے جھنجلاتے رہیں گے، غصہ کرتے رہیں گے، ان چیزوں کے بنانے والے یا نہیں اس مقام پر رکھنے والے کو برا بھلا کہتے رہیں گے۔ بس یہی حال ان لوگوں کا ہے جو اللہ تعالیٰ کی خلائقیت، اس کی وحدانیت اور ربوبیت کا انکار کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کا ذہن (ان کی اپنی ضد کی وجہ سے) اس دنیا میں موجود اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیزوں کے اسباب اور ان کی اہمیت و افادیت کو سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ یہ لوگ اپنے جہل کے سبب ان اشیاء کی خوبیوں اور ضرورت کو نہیں سمجھ پاتے۔“

نوت: پانچ سو سال پہلے کا انسان

اس مثال کو اس طرح بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ مثلاً آج سے پانچ سو سال پہلے کے انسان کو زندہ کر کے آج کے کسی جدید گھر میں رہنے کے لیے کہا جائے تو وہ کیا کرے گا؟ وہ آج کی حیران کن سہولتوں مثلاً لو ہے کی سواریوں (گاڑیوں)، دیوار میں سے آتی آوازوں اور تصویریوں (ٹی وی)، دیوار میں سے نکلتے ہوئے کرنی نوٹوں (ATM مشین)، ہاتھ کو کانوں پر رکھے ہوئے تہائی میں باتیں کرتے ہوئے لوگوں، ہوائی جہازوں، ٹریفک کے ہجوم، گھروں کے اندر انگلی کے اشارے سے آن آف ہوتے ہوئے ٹی وی اور اے سی سے ٹھنڈی ہوا نکلتے دیکھ کر اس پر کیا گزرے گی؟ وہ اپنی کم علمی اور محدود سوچ کے سبب کسی چیز کی اہمیت کو سمجھ ہی نہیں پائے گا، انہیں استعمال نہیں کر پائے گا اور جھنجلا ہٹ کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔ ممکن ہے وہ ان تمام جدید سہولتوں اور ان کے ایجاد کرنے والوں کو ناروا کلمات سے نوازے۔

ای طرح اس عظیم کائنات، اس دنیا اور خود ہمارے وجود میں اللہ تعالیٰ کی خلائقیت کی جو عظیم نشانیاں موجود ہیں وہ کم عقل یا ضد پر آمادہ شخص کے لیے ناقابل یقین اور جھنجلا ہٹ کا سبب ہیں۔ اگر آج کسی عام آدمی کو جو موبائل فون کا استعمال نہیں جانتا، اس کا کوئی مہربان ٹھی سٹم والا ایک بہترین موبائل فون تھے میں دے دے تو اگر اس میں موبائل فون استعمال کرنے یا سیکھنے کی صلاحیت نہ ہو تو وہ بہت جلد اس سے چڑھ جائے گا۔ وہ سمجھ ہی نہیں سکے گا کہ اس کے دوست نے اسے کس قدر فائدہ مند چیز تھے میں دی ہے۔ اپنی جھنجلا ہٹ میں وہ اس سے فائدہ ہی نہیں اٹھا سکے گا بلکہ اسے اپنے لیے ایک مصیبت سمجھنے لگے گا۔

بہت شکر ادا کرنا چاہیے

امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے فرمایا:

”کم عقل، ضدی اور جاہل لوگوں کے بر عکس جو حقائق کو سمجھتے

نہیں ہیں یا سمجھنا ہی نہیں چاہتے..... جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کی معرفت عطا کی ہو اسے اپنے دین کی طرف ہدایت دی ہو اور دنیا میں موجود مخلوقات کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی مصلحت پر غور کرنے اور جن منصوبوں کے تحت یہ چیزیں بہترین طریقے پر پیدا کی گئی ہیں، اسے سمجھنے کی توفیق دی ہو تو ایسے شخص پر لازم ہے کہ وہ اس پر اللہ رب العالمین کی بہت حمد کرے، بہت شکر ادا کرے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرے کہ اللہ نے اسے جو عقل و شعور عطا کیا ہے اور جو معرفت دی ہے اور قوت بیان کی جس صلاحیت سے اللہ نے اسے سرفراز کیا ہے، اللہ رحمان و رحیم اسے اس کے لیے قائم رکھے اور اس میں اضافہ فرمائے کیوں کہ وہ فرماتا ہے ”اگر تم میرا شکر ادا کرو گے تو تمہیں اور زیادہ دوں گا اور اگر میری نعمتوں کا انکار کرو گے تو جان لو کہ میرا عذاب بہت سخت ہے۔“

کائنات کے اجزاء

”مفضل! دیکھو اللہ تعالیٰ کے وجود پر پہلی دلیل تو یہ کائنات ہے، جو ہمارے ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔ ذرا غور تو کرو کہ اس کے اجزاء کس طرح ترتیب دیئے گئے ہیں؟ یہ اجزاء ہیں کیا، کہاں سے آئے؟ اگر تم اس کائنات (یعنی سورج، چاند، ستاروں، کہکشاووں، پھر ان سب کی ایک نئے تلے انداز میں حرکت) پر غور کرو اور ہر

ایک چیز کو الگ الگ کر کے سمجھنے کی کوشش کرو تو تمہیں معلوم ہو گا کہ
یہ سب کچھ کسی اعلیٰ ترین ذات نے پیدا کیا ہے، (اور طے شدہ
منصوبے کے تحت ایک خاص مدت تک کے لیے پیدا کیا ہے)

نوٹ: کائنات کے اجزاء کیا ہیں؟

امام جعفر صادق علیہ السلام کے درج بالا کلمات کی تشریع کے لیے بہت سی کتابیں بھی لکھی جائیں تو اس کلام کی تشریع کا حق ادا نہیں کیا جاسکتا۔ اس کلام کی مختصر وضاحت اس سے بھی زیادہ مشکل کام ہے۔ بہر حال ہم اس سلسلے میں معروف مصنف محمد عبد اللہ صاحب کی ایک بہت مستند کتاب ”کائنات“ سے استفادہ کر رہے ہیں۔ اس سائنسی عبارت کو پڑھنے میں ممکن ہے بعض افراد کو دشواری محسوس ہو لیکن اگر اسے آپ نے پڑھ لیا تو آپ تخلیق کائنات کے بارے میں امام جعفر صادق علیہ السلام کے اس مجذومہ کلام کی قدر و قیمت کا کسی حد تک اندازہ کر سکیں گے۔

”کائنات مادے“ تو انہی اور خلا پر مشتمل ہے۔ ہمارے اطراف میں موجود مادہ مختلف عناصر (elements) یا ان کے کیمیائی مرکبات پر مشتمل ہوتا ہے۔ عنصر مادے کا بنیادی ذرہ ہوتا ہے جس کی ساخت کو کسی کیمیائی ترکیب سے تبدیل نہ کیا جاسکے۔ مثلاً ہائیڈروجن، آئسین، کاربن، فولاد، سونا، یورینیم وغیرہ۔

زمین پر پائے جانے والے عناصر کی مجموعی تعداد تقریباً ۱۰۰ ہے۔ عناصر ایٹم پر مشتمل ہوتے ہیں جبکہ اشیاء ایک یا زیادہ عناصر کے ایٹموں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ہوا، پانی، انسان، کاغذ، قلم، لکڑی، پتھر سب کئی مختلف عناصر کے ایٹموں سے بنے ہوتے ہیں۔ مثلاً ہوا..... ناٹروجن، آئسین
اور ہائیڈروجن وغیرہ کے ایٹموں کی کیمیاوی آمیزش سے تخلیق پاتی ہے جبکہ انسانی جسم ہائیڈروجن، آئسین، ناٹروجن، کاربن، کیلکٹینیم اور فولاد وغیرہ کے ایٹموں پر مشتمل ہوتا ہے۔

ایک ایٹم اپنے مرکز (nucleus) اور الیکٹران پر مشتمل ہوتا ہے جس میں الیکٹرون مرکز

کے گرد گردش کرتا رہتا ہے جبکہ مرکز پروٹون اور نیوٹرون پر مشتمل ہوتا ہے۔ ایک ایٹم کا ذرہ اس قدر چھوٹا ہوتا ہے کہ کسی بھی خرد بین سے اس کا مشاہدہ ممکن نہیں ہوتا۔

بیسویں صدی کے نصف تک ایٹم کو دیکھنا ممکن نہیں تھا لیکن اب پارٹیکل ایکسی لیٹر (Particle Accelerators) سے ایٹم کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ ہائیڈروجن کے ایٹم کا قطر ایک ملی میٹر کے لاکھویں حصے کے مساوی ہوتا ہے جبکہ اس کے مرکز کا قطر پورے ایٹم کے قطر کے دس ہزارویں حصے کے مساوی ہوتا ہے۔

پروٹون اور نیوٹرون کے مقابلے میں الیکٹرون میں ماڈے کی بہت کم مقدار ہوتی ہے۔ ایک ایٹم کا 99.98 فیصد ماڈہ اس کے مرکز میں ہوتا ہے۔ نیوٹرون میں پروٹون کے مقابلے میں تقریباً 0.10 فیصد زیادہ ماڈہ ہوتا ہے۔

اگرچہ تمام نیوٹرون، پروٹون اور الیکٹرون ایک ہی قسم کے ہوتے ہیں لیکن تمام مرکز (Nucleus) ایک جیسے نہیں ہوتے۔ کسی مرکز میں پروٹونوں کی تعداد سے یہ طے ہوتا ہے کہ یہ کس عنصر کا مرکز ہے۔ مثلاً صرف ایک پروٹون پر مشتمل مرکز ہائیڈروجن کا ہوتا ہے، 8 پروٹون کے حامل ایک مرکز سے آ کسیجن کے ایٹم تشکیل پاتے ہیں جبکہ 26 پروٹون سے فولاد کے مرکز کی تخلیق ہوتی ہے، سونے کا ایٹم 79 پروٹونز کا حامل ہوتا ہے اور یورینیم کے مرکز میں پروٹونز کی تعداد کی نشاندہی اس کے ایٹمی نمبر سے ہوتی ہے لہذا معياری آ کسیجن کا ایٹمی نمبر 8 اور یورینیم کا 92 ہوتا ہے۔

سب کی اصل ایک ہے

کائنات میں موجود تمام اشیاء اور جانداروں کی تخلیق ایک ہی بنیادی ماڈے یا ان کے مرکبات سے ہوئی ہے۔ جاندار بظاہر گوشت پوست کی ساخت رکھتے ہیں لیکن ان کے اجزاء بھی ایسے ہی ماڈے پر مشتمل ہوتے ہیں جن سے ستاروں اور سیاروں کی تخلیق ہوئی ہے۔ ستاروں کی تخلیق کا خام مال گیسز اور معدنیات ہوتی ہیں اسی طرح زمین اس پر موجود پودوں، انسانوں اور حیوانوں کی تخلیق کا خام مال بھی یہی ہے، اگرچہ ان کے تناسب میں فرق ہوتا ہے۔ ہم انسانوں کا

جسم تقریباً 63 فیصد ہائیڈروجن، 25 فیصد آکسیجن اور 10 فیصد کاربن پر مشتمل ہوتا ہے جبکہ باقیہ 2 فیصد ماؤنے میں ناٹریوجن، پوتاشیم، کیلیشیم اور دوسرے عناظر ہوتے ہیں۔

سامنہ دانوں کے مطابق خالق کائنات نے زمین پر زندگی کی تخلیق ایک طویل مرحلہ وار ارتقائی عمل کے ذریعے کی۔ اس کے پہلے مرحلے میں گیسوں پر تو انائیوں کے رو عمل میں امام انسن تیزاب (amino acid) وجود میں آئے اور پھر ان سے لحمیات (proteins) پر مشتمل زندگی کے حامل سالموں کی تخلیق ہوئی۔ اس ایک خلیے سے اسی قسم کے اور خلیے اور پھر ان سے دو اور اس سے زیادہ خلیوں پر مشتمل زندگی پیدا ہوتی گئی۔ کروڑوں سال کے ارتقا کے نتیجے میں اور مختلف اقسام کے جانداروں کے ملأپ سے مخلوقات کی نئی اقسام وجود میں آتی رہیں۔ زمین کے زیادہ بڑے جاندار بعد کے دور کی پیداوار ہیں۔ اگرچہ انسانوں سے مشابہ جانداروں (hominids) کا وجود کروڑوں سال قدیم ہے لیکن موجودہ شکل و صورت کا انسان یہاں کی جدید ترین مخلوقات میں سے ہے۔ ہم مکمل انسانوں کی نسل (homo sapiens) ایک لاکھ سال سے زیادہ قدیم نہیں۔

(حوالہ: کائنات۔ مصنف: محمد عبداللہ)

زمین پر ضرورت کی ہر شے موجود ہے

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

”مفضل! تم اس زمین ہی کی نسبت سے دیکھو اور غور کرو تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ کرۂ ارض ایک ایسے مکان کی مانند ہے جس میں وہ تمام چیزیں موجود ہیں جن کی بندوں (یا یہاں کی دوسری مخلوقات) کو ضرورت ہو سکتی ہے۔ مثلاً زمین (گول ہونے کے باوجود) کسی فرش کی طرح بچھی ہوئی ہے۔ آسمان کسی چھت کی مانند ہے اور اس آسمان میں سورج چاند اور ستارے اس طرح

موجود رہتے ہیں جیسے مکان میں بہت سے چراغ رکھے ہوں اور
اپنے اپنے موقع اور مناسبت سے روشن ہوتے رہتے ہوں۔

معدنیات اور جواہرات زمین کے اندر اس طرح پوشیدہ
ہیں جیسے مکان میں خزانے اور مختلف چیزوں کے ذخیرے ہوتے
ہیں۔ ان سب کے علاوہ ضرورت کی ہر شے (مثلاً روشنی، ہوا، پانی،
اناج، بنزین، گوشت، دودھ اور لباس فراہم کرنے والے چوپائے)
اپنی اپنی ضرورت کے مطابق یہاں موجود ہے۔

اور انسان..... انسان اس دنیا میں ایسا ہے جیسے اس مکان کا
مالک اور آقا جس کے قبضے میں اس مکان میں موجود تمام چیزیں
ہیں۔ ان میں سے کوئی چیز حیوانات کی غذا ہے، کوئی انسان کے
لیے دوا، کوئی چیز زینت و آرائش کے لیے ہے۔ کوئی جانوروں کی
دوا، کوئی انسانوں کی غذا، کوئی چیز صرف پرندوں کے لیے، کوئی
چرندوں کے لیے (لیکن ہر چیز کا فائدہ آخر کار انسان کو ملتا ہے۔ مثلاً
گھاس پھونس ظاہر اچوپایوں کی غذا ہیں لیکن ان چوپایوں کا گوشت، دودھ
اور کھال، انسانوں کے کام آتی ہے)۔ قابل توجہ بات یہ بھی ہے کہ
یہاں ہر چیز ایک خاص مقدار میں ہمیشہ مہیا رہتی ہے۔“

نوٹ: ماحولیات کا علم

امام علیہ السلام نے اپنی گفتگو کے آغاز میں مخلوقات اور ان کے درمیان رشتہوں کی بات کی تھی،

اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ سائنس دانوں، ماہرین ماحولیات و حیاتیات نے پندرہویں صدی عیسوی کے بعد کئی صدیوں کی تحقیق و جستجو اور بے شمار تجربات سے معلوم کیا کہ دنیا میں ہر چیز، ہر مخلوق رشتؤں کی ایک نادیدہ زنجیر سے مسلک ہے۔ انھی معلومات کی بنیاد پر ماحولیات (ایکولوجی) کا علم وجود میں آیا۔ آج دنیا بھر کے سائنس دان اور حکومتیں رشتؤں کی اس زنجیر کو بچانے کے لیے تحقیق پر کھربوں ڈال رکھ رہی ہیں۔

رشتوں کی زنجیر

اللہ کی مخلوقات کے درمیان یہ رشته کیا ہیں اور ان کی کیا اہمیت ہے؟ اسے ایک واقعہ سے سمجھا جاسکتا ہے۔

1958ء میں لندن کے ایک قصبے کے رہنے والوں نے محسوس کیا کہ اس موسم میں ہر سال نیلے رنگ کی تتلیاں نظر آیا کرتی تھیں، جو اس دفعہ نظر نہیں آئیں۔ قصبے والوں نے اس کی اطلاع حکومت کو دی۔ حکومت نے ماہرین ماحولیات سے کہا۔ انہوں نے اس قصبے کا دورہ کرنے کے بعد رپورٹ پیش کی اور بتایا کہ گھاس کے میدانوں میں رہنے والے خرگوش کسی بیماری کی وجہ سے بڑی تعداد میں مر گئے ہیں اسی لیے نیلی تتلیاں اس سال پیدا نہیں ہوئیں۔

یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آسکی کہ خرگوشوں کے مرنے سے تتلیوں کا کیا تعلق ہو سکتا ہے!

ماہرین ماحولیات نے بتایا کہ نیلی تتلیاں گھاس کے پتوں پر انڈے دیا کرتی تھیں۔ گھاس کے نیچے رہنے والی چیونٹیاں تتلیوں کے انڈوں کو اٹھا کر نیچے لے جاتی تھیں جہاں ایک خاص درجہ حرارت برقرار رہتا تھا جو تتلیوں کے انڈوں سے لاروا بننے کے لیے ضروری تھا۔ اس سال یہ ہوا کہ جنگلی خرگوشوں میں ایک بیماری پھیل گئی اور وہ بڑی تعداد میں مر گئے۔ یہ جنگلی خرگوش گھاس کو کھاتے رہتے تھے جس کی وجہ سے گھاس لمبی نہیں ہو پاتی تھی۔

خرگوش مرے تو گھاس لمبی ہو گئی، گھاس لمبی ہوئی تو زمین کا درجہ حرارت گرگیا۔ چیونٹیاں جس درجہ حرارت میں رہنے کی عادی تھیں اس درجہ حرارت میں کمی آگئی۔ اس وجہ سے چیونٹیاں اس

علاقے کو چھوڑ کر چلی گئیں۔

اس سال نیلی تلیوں نے گھاس کے پتوں پر انڈے تو دیئے لیکن انہیں نیچے ایک خاص درجہ حرارت کے علاقے تک پہنچانے والی چیزوں نیاں وہاں موجود نہیں تھیں۔ گھاس کے پتوں پر درجہ حرارت زیادہ تھا اس وجہ سے تلیوں کے انڈوں سے بچ نہیں نکل سکے اور اسی سبب سے اس سال نیلی تلیاں قصبه میں نظر ہی نہیں آئیں۔

یہ ہے رشتہوں کی وہ زنجیر جس کے سبب زمینی ماحول میں توازن قائم ہے اور دنیا میں اللہ کی مخلوقات زندہ رہتی ہیں۔ (حوالہ: How Nature Works)

یہ حُسْنِ ترتیب اور ہم آہنگی

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

”مفضل! دنیا (کے ماحول) میں یہ حُسْنِ ترتیب اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ تمام دنیا (یہ ساری کائنات) اس میں موجود مخلوقات مثلًا (حیوانات، نباتات، جمادات) کا کوئی پیدا کرنے والا ہے اور مخلوقات کے درمیان ایک خاص طرح کی ہم آہنگی یہ ثابت کرتی ہے کہ سب کا پیدا کرنے والا ایک ہی ہے جس نے مخلوقات کو ایک مقدار اور معین شدہ منصوبے کے تحت پیدا کیا، انہیں ایک دوسرے سے ہم آہنگ کیا، ایک دوسرے کی ضرورت بنایا۔ اگر اس دنیا کے پیدا کرنے والے ایک سے زیادہ ہوتے تو نظم کائنات میں یہ ہم آہنگی کسی صورت برقرار نہیں رہ سکتی تھی۔“

باب: 2

اگر یہ لوگ اپنے وجود، ہی پر غور کر لیتے!

امام جعفر صادق علیہ السلام نے مفضل ابن عمر سے فرمایا:

”دیکھو مفضل جیسا کہ میں نے اپنی گفتگو کے آغاز میں کہا تھا کہ اللہ کی ذات کا انکار کرنے والے اگر خود اپنے وجود پر ہی غور کر لیتے تو اللہ تعالیٰ کو ماننے پر مجبور ہو جاتے لیکن محدود، سنبھالنے سے اور ناقص معلومات اور اپنی بات پر جھے رہنے کی ضد کے سبب وہ اللہ تعالیٰ کے وجود کے خلاف روزت نئی دلیلیں قائم کرتے ہیں۔“

زندگی کا پہلا مرحلہ

”اب میں تمہارے اور اہل ایمان کے سمجھانے اور ان کے ایمان میں اضافے کے لیے وجود انسانی کی خلقت اور جسم انسانی کی تخلیق و بناؤٹ اور اس میں پوشیدہ اللہ تعالیٰ کی حکمت و مصلحت کو بیان کرتا ہوں۔“

دیکھو انسان کی خلقت کا پہلا مرحلہ تو وہ ہے جب رحم مادر میں جنین (Embryo) کی حفاظت اور پرورش ہوتی ہے۔ جبکہ اس وقت یہ جنین (ماں اور باپ کا مخلوط خلیہ) تین طرح کے پردوں میں بند ہوتا ہے۔“

نوٹ: نئے انسان کا آغاز..... ایک عظیم معجزہ

ایک نئے انسان کی زندگی کا آغاز ماں اور باپ کے مخلوط خلیے سے ہوتا ہے۔ یہ خلیہ اگرچہ جسم کا سب سے بڑا خلیہ ہوتا ہے لیکن حدِ بصارت میں بھی بے مشکل داخل ہوتا ہے۔ یہ خلیہ رحمِ مادر کی دیوار سے جا کر چپک جائے تو ایک نئے انسان کی زندگی کا آغاز ہو جاتا ہے۔

اس خلیے میں اللہ تعالیٰ نے وہ تمام معلومات استور کر رکھی ہوتی ہیں جو اس نادیدہ خلیے کو ایک مکمل انسان بنانے کے لیے ضروری ہیں۔ رحمِ مادر کی دیوار سے چپکتے ہی اس خلیے کو تو انائی اور غذا ملنَا شروع ہو جاتی ہے۔ اس تو انائی کی مدد سے خلیے میں موجود پروگرام کام کرنے لگتا ہے۔

خلیے کے اندر DNA کے دودھاگے ہوتے ہیں: ایک دھاگا مان کی طرف سے اور ایک باپ کی طرف سے۔ ان دھاگوں پر نہیاں اور دھیاں کے اندر موجود تمام خصوصیات کو ڈیزی شکل میں پائی جاتی ہیں۔

DNA کو آپ کسی بلڈنگ کے نقشے سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ رحمِ مادر کی دیوار سے چپکتے ہی خلیے کا نظام اس نقشے کے مطابق انسان کی تعمیر شروع کر دیتا ہے۔ یہ انسان کن خصوصیات کا حامل ہو گا؟ اس کا جسم کیسا ہو گا؟ سر کہاں بنے گا؟ آنکھیں کہاں لگیں گی؟ ہاتھ پیر کان ناک جگر معدہ پھیپڑے کس طرح کہاں اور کس میٹریل سے بنیں گے۔ یہ میٹریل کہاں سے آئے گا۔ کس طرح استعمال ہو گا اور کب اس انسان کا بننا رُک جائے گا، یہ ساری ہدایات DNA پر موجود ہوتی ہیں۔ اس کے مطابق نئے انسان کی تعمیر اور پھر زندگی بھراں کی ثابت و ریخت اور تعمیر و مرمت اسی پروگرام کے مطابق ہوتی رہتی ہے۔ (حوالہ از: جسم کے عجائب)

ماں کے خون سے نئی زندگی

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

”ماں کے پیٹ میں موجود بچہ نہ تو اپنی غذا کے لیے کوئی

اگر یہ لوگ اپنے وجود ہی پر غور کر لتے!

کوشش کر سکتا ہے اور اگر کسی تکلیف میں بٹلا ہو جائے تو اس تکلیف کو دور کرنے کے لیے بھی کچھ نہیں کر سکتا، نہ کسی چیز سے فائدہ حاصل کر سکتا ہے اور نہ اپنی کسی مشکل کو دور کر سکتا ہے۔ اس وقت ماں کے جسم کا خون اس بچے کی طرف جاری ہوتا ہے اور اسے غذا فراہم کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح پانی نباتات کو غذا فراہم کرتا ہے (پودے بھی پانی کے بغیر غذا استعمال نہیں کر سکتے) ماں کا خون بچے کو اس وقت تک فراہم ہوتا رہتا ہے جب تک اس بچے کی خلقت پوری نہیں ہو جاتی اور اس کے بدن کی جلد اس قابل نہیں ہو جاتی کہ ہوا کا مقابلہ کر سکے اور اس کی آنکھ اس قابل نہیں ہو جاتی کہ روشنی کو دیکھ سکے۔

نوٹ: بچے کی جلد اور ہوا

امام علیہ السلام نے فرمایا کہ بچے اس وقت تک پیدا نہیں ہوتا جب تک اس کی جلد ہوا کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں ہو جاتی۔ ممکن ہے اس سے مراد فضا کا دباؤ یا اسٹما سفیرک پریشر ہو۔ فضا کا دباؤ ہر انسان کو ہر طرف سے اتنے وزن سے دبارہا ہے جتنا وزن ایک لاری یا بس کا ہو سکتا ہے۔ لیکن اتنا ہی دباؤ جسم کے اندر سے باہر کی طرف پڑ رہا ہوتا ہے۔ اگر اندر کا دباؤ کم ہو جائے تو پورا جسم اندر کی طرف پچک سکتا ہے۔ (حوالہ: How The Earth Works)

ممکن ہے اس سے مراد ہوا میں موجود جراثیم ہوں۔ اگر بچے کے خون میں وہ اینٹی باڈیز موجود نہ ہوں جو اسے دنیا میں آتے ہی ہر طرف موجود وائرس اور بیکٹریا اور غیرہ سے محفوظ رکھتی ہیں تو بچہ پیدا ہونے کے بعد چند دنوں میں موت کا شکار ہو سکتا ہے۔ یہ اینٹی باڈیز پہلے ماں کے خون اور

اگر یہ لوگ اپنے وجود ہمیں سر غور کر لیتے!

پھر دودھ کے ذریعے بچے کو فراہم ہوتی ہیں اور اسے فوری تحفظ فراہم کرتی ہیں۔

(How Body Works: (حوالہ:

خون، دودھ بن جاتا ہے

امام علیہ السلام نے فرمایا:

”مفضل! جب یہ سب کچھ ہو جاتا ہے تو بچے کی ماں کو درد شروع ہو جاتا ہے جو اسے متھرک اور بے چین کر دیتا ہے، یہاں تک کہ بچہ پیدا ہو جائے اور جب بچہ پیدا ہو جاتا ہے تو ماں کا وہ خون جو بچے کو پیدا ہونے سے پہلے غذا فراہم کر رہا تھا، پیدا ہو جانے والے بچے کے لیے شیر مادر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اب اس کا ذائقہ بھی بدل جاتا ہے اور رنگ بھی اور اب یہ کچھ اور ہی قسم کی غذا بن جاتا ہے جو اس بچے کے مزاج اور اس کی ضرورت کے مطابق ہوتی ہے۔

بچہ پیدا ہوتے ہی اپنے ہونٹوں پر زبان کو پھرانے لگتا ہے اور ہونٹوں کو حرکت دیتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی بھوک کا اظہار کرتا ہے۔ اس کے لیے بہترین اور تازہ غذامان کے ساتھ موجود ہوتی ہے۔ ماں یہ غذا اسے دینا شروع کر دیتی ہے۔

جب تک اس کا بدن نرم، اس کی آنٹیں اور نظام ہضم کمزور رہتا ہے اور وہ سخت غذا استعمال کرنے کے قابل نہیں ہو جاتا اس

اگر یہ لوگ اینے وجودِ حقیقی پر غور کر لیتے!

وقت تک یہ تازہ بہ تازہ غذا (یعنی شیر مادر) بچے کی بھوک مٹانے کے لیے ہر وقت (ماں کے پاس) موجود ہتی ہے۔“

نوٹ: پیدا ہونے کے بعد غذا کی فراہمی

بچے کی فوری غذا اور دوا کے انتظامات بچے کی زندگی کے پہلے لمحے ہی سے شروع ہوجاتے ہیں۔ پلاسینٹانا می بافتہ جو پانی کی تھیلی کی طرح ہوتا ہے اور جس میں بچہ پیدا ہونے سے پہلے زندگی کے کم و بیش نو ماہ گذرتا ہے، حمل کے پہلے ہی لمحے سے ایک ہارمون خارج کرنے لگتا ہے۔ اس ہارمون کو ایسٹروجن کہا جاتا ہے۔ اس ہارمون کی وجہ سے بچے کے لیے موجود دودھ کے کارخانوں کی صفائی اور پھر اس کے اندر تازہ دودھ کی فراہمی شروع ہوجاتی ہے۔ یہ دودھ غذا بھی ہوتا ہے اور دوا بھی۔ بچہ پیدا ہوتا ہے تو قدرت اسے غذا حاصل کرنے کا سلیقہ سکھا کر بھیجتی ہے اور اس کے ہونٹوں کی ذرا سی حرکت دودھ کی نہروں کو جاری کر دیتی ہے۔

(حوالہ از: جسم کے عجائب)

وہ نہیں تھے اور ہو گئے۔

امام علیہ السلام نے فرمایا:

”اللہ تعالیٰ کے وجود کا انکار کرنے والے بھی کبھی ماں کے پیٹ میں تھے۔ بے لب اور کمزور۔ یہ بھی اسی طرح ایک باقاعدہ نظام سے گزر کر انسان کی صورت دنیا میں آئے ہیں۔ انہیں اس سارے نظام اور اس میں موجود اللہ تعالیٰ کی نشانیوں، اس کی مصلحتوں اور مناسبوتوں پر غور کرنا چاہیے کہ کس طرح وہ نہیں تھے اور ہو گئے اور اب اپنے پروردگار کے وجود کا انکار کرتے ہیں اور

دلائل طلب کرتے ہیں۔“

اگر بچہ دانتوں کے ساتھ پیدا ہوتا!

”مفضل اب خلقت انسانی پر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہیں۔

تم دیکھتے ہی ہو کہ بچہ شیرخواری کی مدت سے گزر کر ہلکی اور نرم غذا کھانے کے قابل ہو جاتا ہے۔ پھر وہ اور بڑا ہوتا ہے یہاں تک کہ وہ چلنے پھرنے لگتا ہے۔ اب بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ اسے طرح طرح کی مزید غذاوں کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ اس کا جسم نشوونما پائے اور وہ بچپن سے لڑکپن اور لڑکپن سے جوانی کی منزل تک پہنچے۔ اس کے لیے اب اسے گوشت سبزیوں، سچلوں اور مختلف اناجوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اپنے نرم مسوز ہوں سے ان غذاوں کو استعمال نہیں کر سکتا، اس لیے اب اس کے دانت نکلنا شروع ہوتے ہیں۔

یہ دانت اور داڑھیں روٹی، سچلوں، گوشت اور سبزیوں کو کوٹ اور رگڑ کر نرم غذا میں تبدیل کر سکتی ہیں۔ اس بات پر بھی غور کرو کہ یہ دانت اگر شیرخوارگی کی عمر میں نکل آئیں یا بچہ دانتوں اور داڑھوں کے ساتھ پیدا ہوتا تو یہ اس کی عمر اور ضرورت کے مطابق نہ ہوتا اور اس سے ماں اور بچے دونوں کے لیے بڑی مشکلات پیدا ہو جاتیں۔ اسی لیے دانت اسی وقت نکلتے ہیں جب ان کی ضرورت ہوتی ہے۔ غور تو کرو کہ یہ سب انتظامات

اگر یہ لوٹ اپنے وجود ہی بر غور کر لتی!

ایک خاص اندازے اور منصوبے کے تحت کیا ماڈہ خود کر سکتا تھا!“

نوٹ: ضرورت کے وقت دانت

پیدائش کے وقت بچے کے منہ میں 52 دانت پوشیدہ ہوتے ہیں۔ یعنی دودھ کے 20 اور مستقل رہنے والے 32 دانت۔ دودھ کے دانت اینمل کوٹگ کے ساتھ تقریباً مکمل ہو چکے ہوتے ہیں لیکن اس وقت چونکہ بچے کی غذا صرف مشروبات پر مشتمل ہوتی ہے اس لیے یہ دانت مسوز ہوں میں تیار لیکن عارضی طور پر چھپے ہوتے ہیں۔

چھ ماہ کی عمر میں عموماً دودھ کے دانتوں میں سے سامنے کے نیچے کے دو دانت نکلتے ہیں۔
نوکیلے دانتوں کا بے بی ایڈیشن اٹھارہ ماہ کی عمر میں سامنے آتا ہے۔

دودھ کے تمام دانت دو سال کی مدت میں نکل آتے ہیں۔ مستقل رہنے والے دانت اور داڑھیں بارہ سے اٹھارہ سال کی عمر میں نکلتی ہیں۔ دانتوں اور داڑھوں کا کام غذا کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں اور پھر اسے لعاب دہن کی مدد سے پیس کر ایک طرح کے پیٹ میں تبدیل کرنا ہے تاکہ زبان اس کا ذائقہ محسوس کر سکے اور یہ غذا زبان کی مدد سے حلق کے اندر اور وہاں سے معدے میں جاسکے۔
بھوک مٹ سکے اور یہ غذا جزو بدن بن جائے۔

(حوالہ از: جسم کے عجائب)

داڑھی کی حکمت

”مفضل دیکھو! یہ بچہ ایک نادیدہ وجود تھا۔ پھر یہ گوشت اور ہڈیوں کا مجموعہ بنا۔ پھر اس میں روح آئی۔ پھر یہ ایک خاص مدت تک ماں کے پیٹ میں رہ کر دنیا میں آیا۔ بچپن سے لڑکپن اور پھر جوانی کی منزل تک پہنچا۔

اب جوان ہونے کی صورت میں مرد اور عورت کی اپنی اپنی شناخت ضروری تھی اس لیے نوجوان کے چہرے پر داڑھی نکلنا شروع ہو جاتی ہے۔ داڑھی کے ذریعے یہ نوجوان ایک مرد کی شکل اختیار کرتا ہے۔

لڑکی ہونے کی صورت میں اس کا چہرہ صاف شفاف رہتا ہے۔ اس کے چہرے پر سخت بال نہیں نکلتے تاکہ چہرے کی تازگی اور حسن برقرار رہے اور مرد کے مقابلے میں اس کی الگ سے شناخت ہو سکے۔“

نوٹ: بالوں کی اقسام

بالوں کی مختلف شکلیں اور سائز ہوتے ہیں اور یہ ہمارے پورے جسم پر موجود ہوتے ہیں۔ بھنوؤں اور پلکوں کے بال چھوٹے اور سخت ہوتے ہیں، سر کے بال لمبے اور نرم، جب کہ جسم کی کھال پر یہ باریک روئیں کی صورت پھیلے ہوتے ہیں۔ سر میں ان کی تعداد تقریباً ایک لاکھ اور داڑھی میں ان کی تعداد تیس ہزار کے لگ بھگ ہو سکتی ہے۔ داڑھی کے بال سال بھر میں ساڑھے پانچ اچھے تک بڑھتے ہیں۔ سر کے بال پانچ اچھے سالانہ کے حساب سے بڑھتے ہیں۔

بالوں کی جڑیں جلد کی درمیانی تہہ سے باہر نکلتی ہیں۔ ان کی جڑیں کوفولی کل (FOLLICLE) کہا جاتا ہے۔ خواتین میں بھی بالوں کی اسی قدر جڑیں ہوتی ہیں جتنی مردوں کے جسم میں ہوتی ہیں لیکن ان کی جلد کارروائی نرم اور تقریباً نادیدہ ہوتا ہے۔ خواتین کے چہرے پر جسم کا نظام جلد کا ہم رنگ رواں پیدا کرتا ہے۔ یہاں وہ داڑھی جیسے سخت بال پیدا نہیں کرتا۔

یہ سب کچھ اتفاقیہ نہیں بلکہ ایک پہلے سے بنائے گئے پروگرام کے تحت ہوتا ہے اور یہ پروگرام ہر شخص کی زندگی کے آغاز سے پہلے طے شدہ ہوتا ہے۔ (حوالہ از: جسم کے عجائب)

اب تک کی گفتگو کا خلاصہ

امام علیہ السلام نے فرمایا:

”مفضل! اب تک انسان کی خلقت کا احوال جو میں نے تم سے بیان کیا، اس کا مختصر ادو بارہ جائزہ لیں تو بہتر ہو گا۔ انسان کے دنیا میں آنے کی جو حالاتیں میں نے بیان کیں؛ یعنی ایک ذرہ (خلیہ) پھر لوڑھڑا، پھر گوشت اور ہڈیوں کا مجموعہ، پھر بچہ، بچپن، لڑکپن اور جوانی اور ہر حالت میں انسان کی ضرورت کے مطابق اس کے اعضاء اور صلاحیتوں کا پروان چڑھنا.....

تو کیا یہ سارے انتظامات کسی خالق و مبدہ کے بغیر ہوتے رہے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ جب بچہ رحم مادر میں تھا اس وقت اگر ماں کے خون کے ذریعے اسے غذا فراہم نہ کی جاتی تو وہ زندہ رہ سکتا تھا؟

اس وقت اس کمزور اور بے بس بچے کو (باہر دنیا میں موجود) بہترین غذا میں ماں کے خون کے ذریعے فراہم نہ کی جاتیں تو وہ بچہ اس پودے کی طرح سوکھنہ جاتا جسے پانی نہ مل سکا ہو اور اگر بچہ کی ماں کو مقررہ وقت پر درد بے چین نہ کرتا تو بچہ کس طرح دنیا میں آتا؟ ایسی صورت میں وہ بچہ اسی طرح رحم مادر میں زندہ دفن ہو جاتا جیسے کسی زمانے میں بچے زندہ زمین میں دفن کر دیے جاتے تھے۔“

نوٹ: آکسی ٹوسن نامی ہارموں

ہمارے دماغ میں بیر کے برابر ایک غدوہ ہے جسے پیچو ٹری گلینڈ کہا جاتا ہے۔ بچے کی پیدائش کے لمحوں سے ذرا پہلے یہ غدوہ ایک ہارمون جاری کرتا ہے۔ اس ہارمون کو آکسی ٹوسن (Oxytocin) کہا جاتا ہے۔ یہ ہارمون بچے کی پیدائش سے پہلے شکمِ مادر کے عضلات میں کھنچاؤ پیدا کرتا ہے جس کے نتیجے میں بچے شکمِ مادر کی تہہ تاریکیوں سے نکل کر اس دنیا کی روشنیوں میں آ جاتا ہے۔ اگر بڑے آپریشن کی سہولت موجود ہو تو یہ آکسی ٹوسن ہارمون بھی دماغ کے حکم سے جاری نہ ہو تو ایسی صورت میں ماں کا پیٹ بچے کی قبر میں تبدیل ہو سکتا ہے۔

(حوالہ از: جسم کے عجائب)

تو کیا ایک بے شعور مادے میں یہ صلاحیت ہو سکتی ہے کہ اسے بچے کی پیدائش کے وقت کا پتا چل جائے اور وہ اس خاص وقت میں مذکورہ ہارمون کو جاری کرے اور ہر انسان کی پیدائش کے لیے ہر عمر اور مرحلے میں اس قدر حیران کن اقدامات کر سکے؟

مصلحتیں اور باریکیاں
یہ

امام علیہ السلام نے فرمایا:

”مفضل اس بات پر بھی غور کرو کہ بچے کے پیدا ہونے کے بعد اس کے مزاج اور ضرورت کے مطابق اس کی غذا (ماں کا دودھ) موجود ہوتی تو وہ کس طرح زندہ رہتا۔

اگر ایک خاص وقت پر بچے کے دانت نہ نکلتے تو وہ روئی، گوشت، پھلوں اور سبزیوں کو کس طرح کھا سکتا تھا اور اگر نہ کھاتا تو اس کی نشوونما کس طرح ممکن تھی؟

اگر یہ لوگ اپنے وجود کی بر غور کر لیں!

اگر مرد و عورت ایک جیسے ہوتے تو ان کی شناخت اور ان کے درمیان ایک دوسرے کے لیے کشش کس طرح پیدا ہوتی؟
تمفضل! اب تم دیکھو کہ کیا بغیر کسی پیدا کرنے والے کے یہ سب تدبیریں، یہ مصلحتیں اور یہ باریکیاں ممکن تھیں! تو یہ کہنا کہ کوئی پیدا کرنے والا نہیں ہے، یہ سب کچھ بس خود بہ خود پیدا ہو گیا، ایک احمقانہ سوچ کے سوا کچھ نہیں۔ یہ ملحدین جو کچھ کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس سے بہت برتر ہے۔

اس کے بعد امام جعفر صادق علیہ السلام نے مفضل ابن عمر ایک بڑی حیران کن حقیقت کی طرف متوجہ کیا اور پوچھا۔

”مفضل! تم نے کبھی سوچا کہ انسان کا بچہ کامل عقل کے ساتھ پیدا ہوتا تو کیا ہوتا؟“
(یعنی محضی اور مرغی وغیرہ کے بچے تو پیدا ہوتے ہی تیرنا اور اپنے قدموں پہ کھڑا ہونا سیکھ جاتے ہیں جب کہ انسان کا بچہ بہت عرصے تک ماں باپ کا تھانج رہتا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟)
اس سوال کا جواب اگلے باب میں ملاحظہ فرمائیں۔

بَاب: 3

اگر انسان کا بچہ کامل عقل کے ساتھ پیدا ہوتا!

انسان کی زندگی کے مختلف مراحل اور ہر مرحلے میں اس مرحلے کی مناسبت سے اس کی زندگی کی بقا کے انتظامات یہ ثابت کرتے ہیں کہ انسان اور اس کائنات کا کوئی پیدا کرنے والا ہے۔ کوئی اس کا خالق ہے اور وہ اکیلا ہی خالق و مالک ہے۔ کیوں کہ اگر خالق و مالک دو ہوتے تو انسانی زندگی اور اس پوری کائنات میں ہر جگہ تضاد و اختلاف پیدا ہوتا رہتا۔

اسی حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے مفضل ابن عمر سے فرمایا کہ انسان کا بچہ اگر کامل عقل کے ساتھ پیدا ہوتا تو کیا ہوتا؟ مفضل ابن عمر نے عرض کی: ”آقا! آپ رہنمائی فرمائیں۔ یہ عجیب سوال ہے میں نے پہلے اس پر توجہ نہیں دی۔“

امام علیہ السلام نے تبسم فرمایا اور کہا۔

”انسان کے بچے کے کامل عقل کے ساتھ پیدا نہ ہونے میں اللہ تعالیٰ کی ایسی (ظاہر و پوشیدہ) مصلحتیں ہیں جن پر غور کیا جانا چاہیے۔“

پہلی مصلحت

”انسان کا بچہ اگر کامل عقل و شعور کے ساتھ پیدا ہوتا تو اس دنیا میں آکر وہ چیران اور مدد ہوش ہو جاتا۔ وہ اچانک ہی ایسی چیزوں کو دیکھتا جنہیں اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس وجہ

سے ممکن ہے وہ پیدا ہوتے ہی خوف سے مر جاتا۔ بڑے بڑے درخت، پرندے، انسانوں کے چہرے، طرح طرح کی آوازیں، دروازے، کھڑکیاں یہ سب چیزیں اس نے کبھی دیکھی ہی نہیں تھیں..... وہ انہیں دیکھ دیکھ کر پریشان اور خوف زدہ ہو جاتا۔ وہ ماں کے پیٹ کی تہہ درتہہ تاریکیوں اور ایک مختصر سی جگہ میں رہنے کا عادی تھا۔ اب اچانک اس کی آنکھ کھلتی تو وہاں اسے ایک بالکل ہی اور طرح کی دنیا نظر آتی۔ ان سب چیزوں کو برداشت کرنا اس کے لیے مشکل ہو جاتا۔

مفضل! تم اس بات کو اس طرح بھی سمجھ سکتے ہو کہ اگر کوئی زیادہ عمر کا آدمی کسی غیر ملک میں جا کر رہنا چاہے تو وہ اس اجنبی ماحول، اجنبی زبان، اجنبی لوگوں، رسم و رواج اور وہاں کے قواعد و ضوابط کو دیکھ کر سخت پریشان ہو جاتا ہے۔ وہ نہ وہاں کی زبان جلدی سیکھ سکتا ہے اور نہ وہاں کے ماحول میں جلدی گھل مل سکتا ہے۔

اس کے برعکس جو افراد لڑکپن یا بچپن میں کسی غیر ملک میں جا کر رہنے لگیں تو بہت جلد وہاں کی زبان بھی سمجھنے لگتے ہیں اور وہاں کے رسم و رواج کو سیکھ کر وہاں کے ماحول میں گھل مل جاتے ہیں۔“ (مفہوم قول)

اسی طرح بچہ اگر کامل عقل و شعور کے ساتھ پیدا ہوتا اور آنکھیں کھلتے ہی اچانک اس دنیا کی عجیب عجیب چیزیں، طرح

اگر انسان کا بجھہ کامل عقد کے ساتھ پیسا ہوتا!

طرح کی صورتیں اور قسم قسم کی آوازیں سنتا تو سخت تعجب میں رہتا
اور ایک مدت تک اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ یہ میں کہاں آگیا ہوں
اور یہ جو چیز میں دیکھ رہا ہوں یہ کیا ہے۔

انسان کے بچے کو ابتدا میں کم عقل و شعور کے ساتھ پیدا
کرنے میں ایک حکمت تو یہ ہے جو میں نے بیان کی، -

دوسری مصلحت

”انسان کا بچہ اگر کامل عقل کے ساتھ پیدا ہوتا تو جس طرح
وہ پیدا ہوا اور پھر جس طرح اسے نہلا یا دھلا یا اور کپڑوں میں لپیٹا
جاتا ہے۔ کوئی اسے پیار کرتا ہے، کوئی اسے گود میں اٹھاتا ہے،
کبھی اسے زبردستی دوادی جاتی ہے، کبھی رفع حاجت کے بعد
اسے دھلا یا جاتا ہے..... اب اس کی عقل تو کامل ہے۔ سب
باتوں کو سمجھ رہا ہے لیکن جسمانی طور پر اس قابل نہیں کہ خود اپنی
مرضی سے کوئی کام کر سکے تو وہ بچہ بے بسی کاشکار ہو جاتا۔

اسے خود اپنے آپ سے نفرت و کراہیت محسوس ہونے لگتی۔ وہ
انتہائی ذلت و شرمندگی محسوس کرتا کہ میں نہ خود اپنی بھوک مٹا سکتا
ہوں نہ غلاظت کو دور کر سکتا ہوں۔ نہ کپڑے پہن سکتا ہوں نہ اتار
سکتا ہوں۔ نہ اپنی مرضی سے کہیں جا سکتا ہوں۔ نہ آسکتا ہوں۔“

(یہ سب باتیں بچے کی نفیاں پر انتہائی مضر اثرات مرتب کرتیں)

تیسرا مصلحت

امام جعفر صادق علیہ السلام نے مفضل ابن عمرؓ سے فرمایا:

بچے کو کم عقل کے ساتھ پیدا کرنے میں اللہ تعالیٰ کی تیسرا مصلحت یہ ہے کہ اگر بچہ کامل عقل کے ساتھ پیدا ہوتا تو اس کے اندر وہ معصومیت نہ ہوتی جس کی وجہ سے ماں باپ اور دوسرے محبت کرنے والے ایک معصوم اور بھولے بھالے سے بچے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اسے پیار اور محبت سے پالتے ہیں۔ بچوں کی معصومیت، مسکراہٹ اور ان کی معصومانہ حرکتوں سے محظوظ ہوتے ہیں۔ بچوں کے بھولپن ہی کی وجہ سے دلوں میں ان کے لیے ایک خاص میلان اور رجحان پیدا ہوتا ہے۔

بچہ اگر پیدا ہوتے ہی بڑی بڑی باتیں اور بڑوں جیسی حرکتیں کرنے لگتا تو اس کے پالنے والے بہت جلد اس سے بے زار ہو جاتے اور یہ بات بچے کے لیے سخت نقصان دہ ہوتی۔

ماں باپ بچے کی پروش میں خوشی کے بجائے رنج و تکلیف محسوس کرتے۔ ماں باپ دراصل بچے کی اسی معصومیت اور بھول پن کے سبب ہر وقت اس کا خیال رکھتے ہیں ہر وقت اسی کے کاموں میں مشغول رہتے ہیں۔ اس کی نگہداشت میں ایک خاص طرح کا لطف محسوس کرتے ہیں لیکن اگر بچہ کامل عقل کے

ساتھ پیدا ہوتا تو وہ بار بار شور مچاتا (کہ مجھے کیوں نہ لایا جا رہا ہے۔ آخر یہ جھولے میں مجھے کیوں جھلایا جا رہا ہے)۔ بچہ اپنی عقل چلاتا تو والدین بہت جلد اس سے اکتا جاتے۔“

چوتھی مصلحت

امام علیہ السلام نے فرمایا:

”بچے کو کم عقل کے ساتھ پیدا کرنے میں اللہ رب کریم کی چوتھی مصلحت یہ ہے کہ اگر بچہ کامل عقل کے ساتھ پیدا ہوتا تو ان وجوہات کی بنا پر (جو میں نے پہلے بیان کی ہیں) نہ ماں باپ کے دل میں اولاد سے محبت پیدا ہوتی اور نہ اولاد ماں باپ سے محبت محسوس کرتی۔ ماں باپ تو اس کی نگہداشت، صحت، صفائی، زندگی اور پرورش کے لیے اس کی خدمت کرتے اور بچہ کی عقل ہونے کے سبب ان باتوں سے چڑتا رہتا اور ان سے نفرت محسوس کرتا۔

اس لیے جیسے ہی بچہ چلنے پھرنے کے قابل ہوتا وہ (بہت کم عمری میں) ماں باپ سے الگ ہو جاتا تاکہ اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارے۔ یہ بچہ ماں باپ اور اپنے گھر والوں سے الگ ہو کر معاشرے میں کہیں گم ہو جاتا (جیسے بلی اور کتے کے بچے ذرا بڑے ہو کر گلی کو چوں میں کہیں کھو جاتے ہیں۔)

اگر انسان کا بجھے کامل عقل کے ساتھ پیدا ہوتا!

پھر عمر گزرنے اور بڑے ہونے کے بعد نہ وہ شخص مال باپ کو پہچانتا نہ ہے، بھائی کو۔ نہ حلال رشتؤں کو نہ حرام رشتؤں کو (اس سے معاشرے میں جو خرابی پیدا ہوتی اس کا تصور کسی حد تک ہی کیا جاسکتا ہے۔)

پانچوں مصلحت

امام علیہ السلام نے فرمایا:

”بچے کے باعقول و شعور پیدا ہونے میں جو کم سے کم، اگرچہ یہ سب سے بڑی قباحت اور سخت مکروہ بات ہے وہ یہ کہ بچہ جب پیدا ہوتا تو وہ سب کچھ دیکھتا جسے دیکھنا جائز نہیں تھا،“ (اور اس کے نفیاتی اثرات بچے کی شخصیت کو بری طرح متاثر کرتے)۔

ان تمام وجہات اور مصلحتوں کے سبب اللہ تعالیٰ نے یہ نظام بنایا ہے کہ انسان کا بچہ دنیا میں اس طرح آئے کہ ابتدائی دنوں میں اس کی بے شمار صلاحیتیں خواہید رہیں۔ وہ دنیا و ما فیہا سے بے خبر ہو۔ جو چیزوں دیکھے انہیں اپنی ناقص عقل کے ساتھ دیکھے اور ان کا بھر پور شعور حاصل نہ کر سکے تاکہ نہ وہ حیران و پریشان ہو اور نہ خوف زدہ۔

پھر رفتہ رفتہ اس کی عمر اور ضروریات کے مطابق اس کی عقل بڑھتی ہے۔ اس کا شعور اور اس کی صلاحیتیں اجائے گر ہوتی ہیں تاکہ وہ اس دنیا کی چیزوں کا بتدریج عادی ہوتا رہے۔ آہستہ آہستہ

تمام چیزوں سے مانوس ہوتا جائے اور پھر اس پر قائم رہے۔ پھر وہ اطمینان کے ساتھ اپنے مشاہدے تجربے اور عقل کے ساتھ زندگی گزارنے کا سلیقہ سیکھے۔ بتدریج خیر و شر، نفع و نقصان، نیکی بدی اور اچھائی برائی کے درمیان تمیز کر سکے۔

اب یہ بتاؤ مفضل کہ کیا انسان کی خلقت میں یہ اہتمام یہ منصوبہ بندی یہ مصلحتیں، حکمتیں کیا بے جان مادہ پیدا کر سکتا ہے؟ تم دیکھو کہ انسان کی خلقت کا ہر مرحلہ ہر شے کس قدر بہترین انداز سے طے شدہ ہے۔ کہیں کوئی غلطی کوئی خطأ نظر نہیں آتی۔ تو اللہ کونہ ماننے والوں کے لیے کیا صرف یہ ایک ہی دلیل کافی نہیں ہے کہ وہ گراہی سے نکل کر راہ راست پر آ جائیں۔“

نوٹ: محمد و عقل لامحود امکانات

بظاہر یہ بات عجیب سی لگتی ہے کہ انسان جسے اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات بنایا ہے وہ زندگی کے ابتدائی ایام میں دوسروں کا محتاج ہوتا ہے اور کسی چیز کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ ”ہم نے تمہیں ماوں کے شکم سے اس طرح نکالا کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے (قرآن)۔“

اس کے برعکس کئی مخلوقات مثلاً مچھلی، مرغی، بیخ وغیرہ کے بچے خطرے سے بچنے، رزق تلاش کرنے، تیرنے یا بھاگنے دوڑنے کے ”علم“ کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں۔

اس کی وجہ بہت واضح ہے۔ دیکھیے مرغی یا مچھلی کے بچے محدود عقل کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں، اس لئے کہ ان کا کردار اس کائنات یا اس دنیا میں بہت محدود ہوتا ہے۔ اسی سبب سے ان کا علم بھی محدود رہتا ہے۔

اگر انسان کا بجھے کامل عقل کے ساتھ پیدا ہوتا!

انسان کا بچہ محدود علم کے ساتھ پیدا ہوتا ہے اور بہت عرصہ ماں باپ کا محتاج رہتا ہے لیکن اس کا علم اور اس کی عقل وقت کے ساتھ بڑھتی ہی رہتی ہے اس لیے کہ اس دنیا میں عظیم الشان کارنامے سرانجام دینا ہوتے ہیں۔

مثلاً اگر کسی شخص کو صرف پاپٹل کر بیچنا ہیں تو اسے زیادہ علم یا تجربے کی ضرورت نہیں ہے لیکن اگر کوئی شخص مائیکر و سوفٹ انجینئر بننا چاہتا ہے تو اسے بتدریج علم حاصل کرنا ہوگا۔ ہر کلاس میں بہترین کارکردگی دکھانا ہوگی۔ وہ فزکس ریاضی اور کمپیوٹر سائنس پڑھے گا تب کہیں جا کر مائیکر و سوفٹ انجینئر بن سکے گا۔

بہت سے جانداروں کے بچے محدود علم کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں اور محدود عقل کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں۔ انسان جاہل پیدا ہوتا ہے لیکن علم و عقل کے لامحدود امکانات کے ساتھ۔

باب: 4

بچے روتے کیوں ہیں؟

امام جعفر صادق علیہ السلام نے مفضل بن عمر سے فرمایا:

”کیا تم نے غور کیا کہ بچے روتے کیوں ہیں؟ بچے روتے ہیں اور والدین چاہتے ہیں کہ وہ نہ روئیں۔ بچے کے رونے میں اس کے لیے جو فائدہ ہے، اسے والدین نہیں جانتے۔ وہ بچے کو خاموش کرنے کے لیے اس کی خوشی کے مطابق کام کرتے ہیں تاکہ وہ نہ روئے۔

حقیقت یہ ہے کہ رونا بچے (یا شاید کچھ بچوں) کے لیے بے حد مفید ہوتا ہے۔ دراصل بچوں (یا شاید کچھ بچوں) کے دماغ میں رطوبت ہوتی ہے جو اگر اس میں رہ جائے تو ان بچوں کو کئی طرح کی بیماریوں یا کسی قسم کی معذوری کا سامنا کرنا پڑے۔ مثلًا ان کی بینائی ختم ہو جائے یا سماعت میں خرابی پیدا ہو جائے۔ والدین بچوں کے رونے کو بر اسمجھتے ہیں اور نہیں جانتے کہ رونا ان بچوں کے لیے کس قدر سودمند ہے۔

اسی طرح دنیا میں ممکن ہے ایسی بہت سی بہ ظاہرنا گوار باتیں ہوں جنھیں یہ دہریے دیکھتے ہوں لیکن ان کے پیچھے چھپی ہوئی

اللہ تعالیٰ کی مصلحتوں اور ان کے فائدوں کو نہ جانتے ہوں۔ اگر وہ ان باتوں کو سمجھتے اور ان کے فائدوں کو سمجھتے تو اپنی کم علمی کے سبب یہ نہ کہتے کہ اس میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔ بہر حال جن باتوں کو یہ دہریے نہیں جانتے، انہیں اللہ کی معرفت رکھنے والے جانتے ہیں۔“

نوٹ: درد اور تکلیف

درد اور تکلیف یا بہت سی مشکلات اور ناگوار باتوں کو کوئی بھی شخص پسند نہیں کرتا۔ لیکن سمجھدار لوگ جانتے ہیں، ماہرین حیاتیات کو علم ہے کہ یہ درد، تکلیف اور زندگی کی مشکلات جو ہمیں بہ ظاہر بری لگتی ہیں، بہ باطن یہ اللہ رب کریم کی عظیم نعمتیں ہیں۔

مثلاً جسم کے اندر کسی بھی قسم کا درد خود کوئی بیماری نہیں بلکہ کسی عضو میں پیدا ہونے والی خرابی کا سگنل ہوتا ہے اور انسان کو معانج تک لے جانے کا سبب بن جاتا ہے۔ جن لوگوں کو درد محسوس نہیں ہوتا وہ کسی دن اچانک ہی دنیا سے گزر جاتے ہیں۔

اس کے لیے صرف ایک مثال پر اکتفاء کریں گے کہ جن لوگوں کو شوگر کی بیماری ہوتی ہے اور اس کے ساتھ انہیں ہائی بلڈ پریشر بھی ہوتا انہیں دل کا درد محسوس ہی نہیں ہوتا۔ انہیں بلکہ ہارٹ اٹیک ہوتے رہتے ہیں لیکن اکثر اوقات انہیں پتا نہیں چلتا۔ جب درد محسوس نہیں ہوتا تو وہ ڈاکٹر کے پاس بھی نہیں جاتے اور اس طرح اپنی بیماری سے غافل رہتے ہیں اور پھر اچانک ہی کسی دن اس دنیا سے گزر جاتے ہیں۔

اسی طرح مشکلات اور ناگوار باتیں انسانوں کو گناہوں سے روکتی ہیں اور دنیا کی رنگارنگی سے نکال کر انہیں اللہ رب کریم کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ اس کے جو فائدے ہیں انہیں ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔

بچوں کے منہ سے رال بہنا

امام جعفر صادقؑ نے مفضل بن عمرؓ کو ایک اور بات بتائی۔ آپؑ نے فرمایا:

”اسی طرح بچوں کے منہ سے رال بہنے کا معاملہ ہے۔ یہ

وہ رطوبت ہے جو اگر جسم کے اندر رہ جائے تو بڑے بڑے
امراض مثلاً فانج، لقوہ، کم عقلی، پاگل پن جیسے امراض کا سبب بن
سکتی ہے۔

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے جسم کے اندر ایسا (خودکار) نظام بنایا
ہے کہ یہ رطوبت (یعنی رال بچوں کے منہ سے بہتی رہتی ہے تاکہ
جب یہ بچے بڑے ہوں تو صحیت مند رہیں (یعنی بڑے ہونے کے
بعد نارمل ہوں، ایب نارمل بچے نہ ہوں)۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ ایک
ایسی عظیم نعمت بخشی ہے جس کی قدر و قیمت کو عام لوگ نہیں سمجھ
پاتے اور اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعے انہیں زندگی بھر کے لیے
ان مشکلات و امراض سے بچایا ہے جن کا یہ ادراک نہیں کر
سکتے۔“

نوٹ: بچوں کا رونا، رال بہنا

یہ بات تو ایک عام آدمی بھی جانتا ہے کہ بچے کا پیدا ہونے کے فوراً بعد رونا اس کی زندگی کے
لیے ناگزیر ہے۔ پیدا ہونے والا بچہ فوراً ہی چیخ مار کر رونا شروع کر دیتا ہے۔ چیخ مارنے اور پھر
رونے کے عمل سے اس کے پھیپھی کا مکرنا شروع کر دیتے ہیں۔

اس سے پہلے ماں کے پیٹ میں وہ ماں کے پھیپھڑوں کے ذریعے سانس لے رہا ہوتا ہے۔ ولادت کے فوراً بعد ضروری ہے کہ اس کے اپنے پھیپھڑے سانس لینے اور باہر نکالنے کا کام شروع کریں۔ اسی لیے بچہ پیدا ہوتے ہی رونا شروع کرتا ہے۔ اس طرح آنسو جن زیادہ مقدار میں اس کے پھیپھڑوں میں پہنچتی ہے اور پھر اس کے پھیپھڑے تا حیات ایک خود کار نظام کے تحت کام کرتے رہتے ہیں۔

امام علیہ السلام کا ارشاد اور میڈیکل سائنس

ولادت کے فوراً بعد بچے کے رونے اور منہ سے رال بہنے کی حکمت کے بارے میں ماہرین حیاتیات کو جو معلومات ملی ہیں وہ اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی میں حاصل ہوئی ہیں جب کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے کم و بیش ساتویں صدی عیسوی میں اس زمانے کے لوگوں کی عقل کے مطابق مختصر آن حقائق کے بارے میں بتا دیا تھا۔

آج کے دور 2012ء میں ماہرین حیاتیات اور معالجین کے مطابق بچے کے زیادہ رونے میں کوئی فائدہ نہیں سوانعے اس کے کہ اس کا رونا بچے کی کم غذا بیت یا اس کے جسم میں کسی اندر ونی بیماری کی نشان دہی کرتا ہے۔ (آپ غور فرمائیں کہ کیا یہ کم فائدہ ہے؟)

ڈاکٹروں کے مطابق رونے سے جو آنسو بہتے ہیں وہ دراصل ایک جراثیم کش مادے لائی سوزائم (Lysozyme) پر مشتمل ہوتے ہیں۔ یہ مادہ جراثیم کش ہوتا ہے۔

جراثیم آنکھوں میں طرح طرح کی بیماریاں پیدا کر سکتے ہیں۔ یہ جراثیم کش مادہ دونوں آنکھوں کے اگلے حصے میں موجود غددوں میں تیار ہوتا ہے اور ہر مرتبہ جب ہم پلک جھکاتے ہیں تو یہ مادہ پوری آنکھ پر پھیل کر اسے جراثیم سے ساف کر دیتا ہے اس کے بعد ہر مرتبہ یہ مادہ آنکھ کے ناک کی جانب والے حصے میں موجود ایک مقام پر جذب ہوتا رہتا ہے۔

امام علیہ السلام نے فرمایا کہ دماغ میں رطوبت ہوتی ہے جو رونے سے خارج ہو جاتی ہے۔ (ہمیں اپنی کم علمی کا اعتراف ہے اور عربی کی اصل عبارت سامنے نہیں ہے کہ فیصلہ کر سکیں کہ امام نے ”دماغ“ کا لفظ استعمال فرمایا ہے یا ”جسم“ کا۔ ممکن ہے یہاں مترجم کو غلط فہمی ہوئی ہو۔)

آج کے ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ یہ رطوبت دماغ میں نہیں ہوتی بلکہ اسے دماغ کے حکم پر آنکھوں پر موجود لکر یہ مل گینڈ ز تیار کرتے ہیں۔ بہر حال ماہرین اس حقیقت کو مانتے ہیں کہ آنکھوں میں یہ آنسو یا جراثیم کش رطوبت نہ ہو تو انسان کی بینائی تک ختم ہو سکتی ہے۔

بچوں کی رال بہنے میں ماہرین حیاتیات کے نزدیک ابھی تک دو فائدے ہیں۔ یہ رال بھی جراثیم کش ہے اور غذا کھانے اور اسے ہضم کرنے میں مدد فراہم کرتی ہے۔ اسے ہم عام طور پر لعاب دہن کہتے ہیں لیکن اس کی قدر و قیمت کا معمولی سا بھی اور اک نہیں رکھتے۔ یہ رطوبت منہ حلق اور حلق سے معدے تک جانے والی نالی میں موجود ہتھی ہے۔ اس رطوبت کو سلاسیوا کہا جاتا ہے۔ اس کے بغیر ہم روٹی کا نوالہ تو کیا سونف کا ایک دانہ تک حلق سے نہیں اتارتے۔ ہماری غذا جب اس رطوبت کی مدد سے نیم سیال میں تبدیل ہوتی ہے تو ہم کسی غذا کا ذائقہ محسوس کر پاتے ہیں۔ یہ رطوبت منہ اور زبان پر موجود غددوں سے پیدا ہوتی ہے۔

ماہرین حیاتیات کے مطابق منہ کی رطوبت نہ ہو یا بہت کم ہو تو ایسی صورت میں منہ کا السر اور دانتوں کی کئی بیماریاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ آج کے ماہرین کے مطابق اس رال کے بہنے یا نہ بہنے سے کم عقلی، پاگل پن، فانچ یا القوے کی بیماری کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

یہ معلومات جتنی نہیں

میڈیکل سائنس بہر حال تحقیق و جستجو میں مصروف ہے۔ ممکن ہے آئندہ زمانوں میں ماہرین حیاتیات اس حقیقت کو معلوم کرنے میں کامیاب ہو جائیں جس کی طرف امام جعفر صادق علیہ السلام نے اشارہ فرمایا ہے۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ہمارے دماغ میں موجود ایک غدد جسے پیچوڑی گینڈ کہا جاتا ہے، اس کے لیے انیسویں صدی کے آغاز تک ماہرین حیاتیات کی معلومات بہت محدود تھیں۔ ان کے خیال میں اس غدد کا کام صرف ناک میں پیدا ہونے والی جراثیم کش رطوبت کو پیدا کرنا تھا لیکن جب انیسویں صدی کے نصف آخر میں نئے اور جدید آلات ایجاد ہوئے اور تحقیق کے نئے راستے

کھلے تو معلوم ہوا کہ پیچوڑی گلینڈ اپنے ہارموز کے ذریعے جسم کے تمام غدد کو کنٹرول کرتا ہے اور ایسے ہارمون خارج کرتا ہے جن کی عدم موجودگی کی صورت میں پورا جسم گوشت اور ہڈیوں کے ڈھیر میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ آج اسی پیچوڑی گلینڈ کو جسم کا ماسٹر گلینڈ کہا جاتا ہے۔ اس گلینڈ کا سائز بیر کے برابر اور یہ 85% پانی پر مشتمل ہوتا ہے۔ (حوالہ: جسم کے عجائبات)

اگر یہ نعمتوں کو جانتے اور غور کرتے.....

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

”اگر یہ لوگ (یعنی وجود خدا کا انکار کرنے والے) خود اپنے ہی جسم میں موجود اللہ تعالیٰ کی ان تمام نعمتوں (اعضاء اور ان کی کارکردگی) کو جانتے (یا کسی سمجھانے والے کی بات پر کان دھرتے، اس کی بات پر یقین کرتے، اس پر ایمان لے آتے) تو کبھی بھی کفر جیسے گناہ میں مبتلا نہ ہوتے۔

پس ہم اللہ تعالیٰ ہی کی حمد و ثناء بیان کرتے ہیں اور عظمت و بزرگی اسی ربِ کریم کے لیے مخصوص ہے جس نے مستحق اور غیر مستحق کو یہ نعمتیں عطا فرمائیں۔ اس کی ذات ان باتوں سے بالآخر ہے جن باتوں کو یہ منکر خدا بیان کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ خود بے خود پیدا ہو گیا ہے بغیر کسی خالق و صانع کے۔ شاید اب بھی یہ غور کریں، معرفت حاصل کریں اور خدا شناس بن جائیں۔“

انسانی اعضاء کی خلقت

امام جعفر صادقؑ نے مفضل ابن عمرؓ سے فرمایا:

”مفضل ذرا غور تو کرو کہ انسانی جسم کے اعضاء کیوں بنائے گئے؟ ان کی ضرورت کیا تھی؟ اور یہ اعضاء کیا خدمات سرانجام دیتے ہیں؟ ان اعضاء کو بنانے میں اور ہر عضو کو ایک خاص مقام پر پیدا کرنے میں اللہ تعالیٰ کی کیا مصلحت ہے اور انسانوں کے لیے اس میں کس قدر آسانیاں اور سہولتیں موجود ہیں؟ کیا زمانہ مادہ یا فطرت (نیچر) میں یہ شعور ہے کہ وہ ایک خاص منصوبہ بندی کے ساتھ اس انسانی جسم کی تعمیر کر سکے؟ اچھا! دیکھو دو ہاتھ تو کام کرنے کے لیے ہیں۔ دونوں پاؤں چلنے کے لیے انسان کو دیے گئے۔ آنکھیں راہ دیکھنے کے لیے۔ منہ غذا کھانے کی غرض سے اور معدہ اس غذا کو ہضم کرنے کے لیے دیا گیا۔ جگر غذا کا جو ہرنکا لئے کے واسطے اور اعضائے تولید اور افراش نسل کے لیے عطا کیے گئے وغیرہ وغیرہ۔

اب اگر تم ان تمام اعضاء، ان کی بناؤٹ، کارکردگی اور جسم کے اندر ان کے مقام پر غور کرو گے تو سمجھ جاؤ گے کہ ہر عضو ایک خاص مصلحت کے ساتھ پیدا کیا گیا اور جسم کے ہر عضو کا دوسرے عضو سے ایک خاص رشتہ اور رابطہ ہے۔ یہ تمام عضو مول کر انسانی

جسم کی تشکیل کرتے ہیں اور انسان کو وہ تمام سہوتیں فراہم کرتے ہیں جس کی اسے زندگی گزارنے کے لیے ضرورت ہے۔“

نوٹ: جسمانی اعضاء اور ان کے کام

انسانی جسم کے اعضاء، جسم میں ان کے مقام اور ان کی کارکردگی کے بارے میں امام نے جو کچھ فرمایا وہ اس زمانے کے انسانوں کی ذہنی سطح کو سامنے رکھ کر فرمایا اور مختصرًا اتنا ہی بتایا جسے اس زمانے کا انسان کسی قدر سمجھ سکے اور اعضاء کی قدر و قیمت کا کسی قدر اندازہ لگا سکے۔

جسم کے اعضاء ان کی تعمیر اور ان کی کارکردگی کے بارے میں حقیقت (جس سے امام اس وقت بھی واقف تھے) اس قدر حیران کن اور عقل کو ششدرا کر دینے والی ہے کہ جدید سائنسی دور میں اس موضوع پر ہزاروں لاکھوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور بے شمار تحقیقات سامنے آجائے کے باوجود آج کے ماہرین حیاتیات انسانی جسم اور اس کے اعضاء کی کارکردگی کے بارے میں یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ انہوں نے جسم کے اعضاء اور کارکردگی کے بارے میں بہت کم معلومات حاصل کی ہیں۔ ابھی بہت کچھ معلوم کرنا باقی ہے۔ ہم جدید ایناٹومی (علم الابدان) اور فزیالوجی (علم فعلیات) کی مدد سے مختصرًا صرف ان اعضاء کے بارے میں عرض کریں گے جن کا تذکرہ امام علیہ السلام نے فرمایا ہے۔ پورے جسم کے بارے میں قارئین کسی قدر زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہیں تو ہماری کتاب ”جسم کے عجائب“ کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

ہمارے ہاتھ اللہ کی صناعی کا عظیم شاہکار

یہ دونوں ہاتھ ہمیں پیدائشی طور پر ملے ہیں، بے مانگے اور مفت ہاتھ آئے ہیں اس لیے شاید ہمیں اللہ تعالیٰ کے ان تخفیوں کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں ہے۔ یہی ہاتھ ہمیں بعد میں ضرورت محسوس کرنے کے بعد ملتے اور قیمتاً ملتے تو شاید ہم ہاتھ دینے والے کاشکریہ ادا کرتے کرتے نہ تھکتے۔

ہمارے ہاتھ اللہ تعالیٰ کی صناعی کا عظیم نمونہ اور اس کی بے مثال ٹیکنالوجی کا عظیم شاہکار

ہیں۔ ہمارے ہاتھ ہڈیوں، جوڑوں اور انہیں سنبھالنے والے بافتوں، ڈوریوں اور پٹیوں کا مجموعہ ہیں اور دماغ کے حکم پر حیران کن خدمات سر انجام دیتے ہیں۔

دنیا میں ٹیکنالوجی کے تمام ترقیوں نے زمین سے نکل کر خلاء میں سفر کرتے خلائی جہاز، تمام آلات، مشینیں، مصوری، مجسمہ سازی، ادب، موسیقی اور شاعری کے تمام شاہکار غرض انسان کی بنائی ہوئی ہر چیز ہاتھوں اور دماغ کی بہترین ورکنگ ریلیشن شپ (ہم آہنگ) ہی کے سبب وجود میں آئی ہے۔ وہی ہم آہنگ جس کا تذکرہ امام علیہ السلام نے فرمایا ہے۔

دماغ کے اندر دونوں ہاتھوں کی حرکات و سکنات کو کنٹرول کرنے اور ان کی نگرانی کرنے کے لیے دو بڑی جگہیں مخصوص ہیں، انہیں موڑ کو ٹیکس کہا جاتا ہے۔ اگر آپ اپنے انگوٹھے کو ذرا سی حرکت دیتے ہیں تو اس بظاہر سادہ سی حرکت کے پیچھے ایک حیران کن نظام کام کر رہا ہوتا ہے۔ اس معمولی حرکت کے لیے بھی دماغ سے ہاتھ اور ہاتھ سے دماغ کے درمیان ہر سینٹڈ میں ہزاروں بر قی کیمیائی پیغامات سفر کر رہے ہوتے ہیں اور بے شمار الیکٹریکل، میکنیکل اور بر قی کیمیائی عمل اور رد عمل رونما ہو رہے ہوتے ہیں۔

چالیس پینتالیس سال کے عرصے میں صرف انگلیوں کے کھلنے اور بند ہونے کا عمل کم از کم چھپیں کروڑ مرتبہ دہرایا جا چکا ہوتا ہے لیکن انگلیاں خراب ہوتی ہیں نہ ان کے جوڑ۔

ایک ہاتھ کی کلائی میں آٹھ ہڈیاں پائی جاتی ہیں۔ 5 ہڈیاں پنجے میں اور 14 ہڈیاں انگلیوں کے جوڑوں میں ہوتی ہیں۔ اگر دونوں ہاتھوں کی ہڈیوں کو جمع کر لیا جائے تو یہ کل 54 ہڈیاں ہوتی ہیں۔ یعنی تمام جسم کی کل ہڈیوں کی ایک چوتھائی ہڈیاں صرف دونوں ہاتھوں میں پائی جاتی ہیں۔

ہاتھوں کی جلد میں اعصاب کا بہت بڑا نیٹ ورک پایا جاتا ہے جس کے ذریعے انسان گرمی سردی، نرمی، سختی، درد یا راحت کو محسوس کر سکتا ہے۔ انگلیوں اور ہتھیلی کی جلد خاص انداز کی ہوتی ہے۔ اگر انگلیوں کی جلد پر نظر نہ آنے والی لائنیں نہ ہوتیں تو بہت سے کام مثلاً قلم پکڑنا، سوئی اٹھانا، کار کے اسٹیرنگ و ہیل کو مضبوطی سے پکڑنا آپ کے لیے مشکل ہو جاتا۔

انگلیوں کی اہمیت اپنی جگہ لیکن اگر ہمارا انگوٹھا نہ ہوتا تو ہمارے لیے کوئی بھی چیز پکڑنا ممکن نہ رہتا۔ ایسی صورت میں ہاتھ بالکل اس پلاس کی طرح ہوتا جس کا ایک بازو موجود نہ ہو۔

آپ کے دونوں ہاتھ ڈوریوں اور پیسوں کی مدد سے دماغ کے احکامات کے مطابق حرکت کرتے ہیں۔ انگلیاں، انگوٹھا اور اس کے جوڑ انھی ڈوریوں اور پیسوں کی مدد سے کھلتے اور بند ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر اس وقت یہ تحریر لکھی جائی ہے تو بظاہر اسے ہاتھ لکھ رہا ہے لیکن ساری معلومات جملوں کی ترتیب، ان کا املا، سب کچھ دماغ میں موجود ہے۔ دماغ ان تمام معلومات کے حروف، الفاظ، سطور اور پیراگرافوں کو ہاتھ کی مدد سے کاغذ پر منتقل کر رہا ہے۔

ہاتھوں کی کچھ صلاحیتیں بڑی حیران کن ہیں۔ یہ ہاتھ نا بینا افراد کے لیے آنکھیں بن جاتے ہیں۔ آپ جیب میں ہاتھ ڈال کر مطلوبہ سکے کو بغیر دیکھے پہچان لیتے ہیں۔ خواتین کپڑے کو چھو کر اس کی کوالٹی کا اندازہ کر سکتی ہیں۔ کسان مٹی کو ہاتھ میں لے کر اس کے بارے میں بہت کچھ بتا سکتا ہے۔

انگلیوں کی جلد بے حد حساس ہے۔ یہاں جلد کے ہر مرتع انج کے اندر جلد کے نیچے ہزاروں اعصاب کے آخری حصے موجود ہیں۔ اعصاب کا مطلب ہے اطلاعاتی مراکز جو ہر لمحے دماغ سے رابطے میں رہتے ہیں، اسے اطلاعات فراہم کرتے اور اس کے احکام پر عمل درآمد کرتے رہتے ہیں۔

پاؤں، قدرت کی ٹیکنا لو جی کا عجوبہ!

انسانی جسم پر تحقیق کرنے والے ماہرین حیاتیات، انسانی پیروں کو قدرت کی انجینئرنگ اور ٹیکنا لو جی کا ایک شاہکار کہتے ہیں۔ دونوں پاؤں ایک انہائی پُر پیچ مشین ہیں جو دماغ کے احکامات کے مطابق ہمارے لیے حیران کن کام سرانجام دیتے ہیں۔

جب آپ صرف کھڑے ہوتے ہیں۔ اس وقت آپ کے ذہن میں پیروں کا کوئی تصور نہیں ہوتا لیکن اس وقت بھی یہ پاؤں دماغ کی ہدایت کے مطابق ہر لمحے آپ کے لیے حیران کن خدمات سرانجام دے رہے ہوتے ہیں۔ اگر پاؤں یہ خدمات سرانجام نہ دیں یادِ دماغ اور پاؤں کے درمیان یہ رابطہ ایک لمحے کو بھی منقطع ہو جائے تو آدمی خالی بوری کی طرح زمین پر ڈھیر ہو جائے۔

اس وقت ہر پاؤں اپنی 26 ہڈیوں، 107 لیگا مینس (جھلی کی بنی ہوئی ٹپیوں) اور 19 پٹھوں کے پُر اسرا اور پیچیدہ عمل اور ردِ عمل کے ذریعے دماغ کو لمحہ بہ لمحہ سینکڑوں پیغامات ارسال کر رہا ہوتا ہے اور پھر اس کی جانب سے آنے والے احکامات کے مطابق ڈیڑھ سو پونڈ وزنی اور سائز ہے پانچ فٹ لمبے جسم کے توازن کو صرف سات آٹھ انچ کی مختصری جگہ پر سنبھالے رکھنے کے لیے ہر لمحہ ایک نئی حکمت عملی اختیار کر رہا ہوتا ہے تاکہ آپ آرام سے کھڑے رہیں۔ آپ کا توازن نہ بگڑئے آپ کسی طرف کو گرنہ جائیں۔ ایڑیوں میں موجود موافقی نظام دماغ کو آپ کے ہر لمحہ بدلتے ہوئے زاویے اور وزن کے بارے میں اطلاعات فراہم کرتا رہتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ فلاں جانب وزن بڑھ رہا ہے جسم فلاں زاویے پر مڑ رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔ دماغ ان معلومات کی روشنی میں ہمارا توازن برقرار رکھنے کے لیے پیروں کو احکامات جاری کرتا رہتا ہے۔ مثلاً فلاں پٹھے کو کھینچو، فلاں پٹھے کو ڈھیلا چھوڑ دو۔

توانائی کی فراہمی

ہر کام کی طرح کھڑے ہونے کے لئے بھی آپ کو خاص مقدار میں تو انائی درکار ہوتی ہے۔ آپ کو مطلوب تو انائی کا اندازہ کر کے پیروں کا موافقی نظام دماغ میں موجود ایک مقام (ہائی پو تھیلی مس) کو مطلع کرتا ہے۔ یہ ہائی پو تھیلی مس، ما سٹر گلینڈ (یعنی پیچوڑی گلینڈ کو ان ضروریات سے آگاہ کرتا ہے۔ ما سٹر گلینڈ خون میں ایک ہارمون شامل کرنے لگتا ہے، جو براہ راست آپ کی گردن پر موجود جسم کے تو انائی گھر (تحائی رائیڈ گلینڈ) کو موصول ہوتا ہے۔ یہ گلینڈ (غدوو) س کے ردِ عمل میں اپنا ایک ہارمون خون میں شامل کر دیتا ہے۔ یہ ہارمون جسم کے سو ٹریلیون خلیوں میں موجود تو انائی گھروں (MITOCONDRIA) کو آن کر دیتا ہے (ہر خلیے میں ایک ہزار تو انائی گھر پائے جاتے ہیں)۔ اس طرح پیروں کی ضرورت کے مطابق تو انائی گلینڈ کے ہزاروں حصے میں فراہم ہو جاتی ہے۔ ہم چلتے ہیں، گھومتے پھرتے ہیں تو ہم کبھی اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کا تصور بھی نہیں کر سکتے جو اس کا بنایا ہوا جسمانی نظام ہمیں زندگی بھر ہر لمحے فراہم کرتا رہتا ہے۔

کیا یہ اعضا خود بے خود بن جاتے ہیں!

امام علیہ السلام کی باتیں سن کر مفضل ابن عمرؓ نے عرض کی:

”آقا! کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ سب باتیں طبیعت (نیچر) کے سبب پیدا ہوتی ہیں یعنی جس مخلوق کو جس طرح کے اعضا کی ضرورت ہوتی ہے وہ خود بے خود بن جاتے ہیں۔“

امام علیہ السلام نے فرمایا:

”مفضل! ایسے لوگوں سے سوال کیا جائے کہ کیا طبیعت (نیچر) جو اس قدر عظیم اور با مصلحت کام اس قدر باریک بنی سے سرانجام دیتی ہے تو کیا وہ علم، ارادہ اور قدرت بھی رکھتی ہے یا وہ بے شعور و بے ادراک ہے اور اس میں قوت ہے نہ علم؟ اب اگر وہ کہتے ہیں اس میں علم ارادہ اور قدرت ہے تو پھر انہیں خلق کرنے والی ذات (اللہ) کو ماننے سے کیا چیز روکتی ہے؟ اور اگر یہ اللہ کا انکار کرنے والے کہتے ہیں کہ طبیعت (یعنی نیچر) بے علم، بے ارادہ و بے قدرت ہے اور بغیر کسی علم و قدرت کے چیزوں کو بنادیتی ہے تو یہ امر محال ہے کہ بے عقل، بے ارادہ، بے قدرت شے اس قدر علم و حکمت، مصلحت و باریک بنی کے ساتھ کسی صاحب شعور و ادراک شے کی تخلیق کرے۔“

نیچر اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا ایک نظام ہے

”وَمُفْضِلٌ دِيْكَحُوا! أَصْلُ بَاتٍ يَهُوَ هُوَ كَهُوَ يَهُوَ تِمَامٌ مُخْلوقَاتُ اللَّهِ
رَبِّ كَرِيمٍ كَيْدَرَا كَرَدَهُ ہیں اور جسے یہ لوگ طبیعت (نیچر) کہتے
ہیں یہ اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا ایک نظام ہے جسے اس نے (اپنی حکمت
سے) مخلوقات میں جاری کر دیا ہے۔“

نوٹ: فطری انتخاب کا نظریہ

امام علیہ السلام کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ کسی چڑیا یا تلی میں یہ قدرت نہیں ہے کہ وہ ماحول
اور ضرورت کے مطابق اپنے ذاتی ارادے سے خود اپنی چونچ چھوٹی یا بڑی کر سکے یا کوئی تلی دشمن
سے بچنے کے لیے خود اپنے رنگ کو تبدیل کر کے پتوں کی ہم رنگ ہو جائے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا
ایک نظام ہے جو چڑیا یا تلی یا دوسری مخلوقات کی بقاء کے لیے ان میں تبدیلیاں پیدا کرتا ہے۔

مشہور سائنسدان چارلس ڈارون نے اٹھارویں صدی عیسوی میں مشہور نظریہ ارتقاء پیش کیا
اور بتایا کہ تمام ذی حیات اپنے ماحول، موسم اور ضروریات کے مطابق اپنے اندر تبدیلیاں پیدا
کرتے ہیں۔ ہم اپنے قارئین کو اس طرف متوجہ کرنا چاہیں گے۔

دیکھئے! چارلس ڈارون نے نیچرل سلیکشن (فطری انتخاب) کے حوالے سے جو نظریہ اٹھارویں
صدی عیسوی میں پیش کیا، وہ خود اس کا نظریہ یا تحقیق نہیں تھی بلکہ اس نے یہ نظریہ دراصل اسلام کے
علمی دسترخوان سے حاصل کیا تھا جس کا ثبوت درج بالا سوال ہے جو مفضل ابن عمرؓ نے امام جعفر صادق
علیہ السلام سے کیا اور امامؓ نے اس کا تفصیلی جواب دیا۔ دوسری صدی ہجری (یعنی آٹھویں صدی
عیسوی) میں ہونے والی یہ علمی گفتگو اس وقت ہوئی جب کہ چارلس ڈارون کے پیدا ہونے میں ابھی
صدیوں کا فاصلہ تھا۔

اس باب میں ہم نے امامؓ کے صرف دو جملوں کی سرسری وضاحت پیش کی ہے۔ آئندہ باب
میں آپ نظام ہضم کے اعضا کے بارے میں امامؓ کے ارشادات اور ان کی کسی قدر تفصیل جان سکیں گے۔

باب: 6

غذا کس طرح خوشگوار ہوتی ہے؟

امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے شاگرد مفضل ابن عمرؓ کو غذا کھانے، اس کے ہضم ہونے اور جزو بدن بننے کے پُر اسرار و پیچیدہ عمل کی طرف متوجہ فرمایا:

”مفضل! ذرا اس بات پر غور کرو کہ کس طرح انسان غذا کو استعمال کرتا ہے؟ یہ غذا کس طرح اس کے لئے خوشگوار ہوتی ہے؟ کس طرح اور کن مراحل سے گزر کر اس کے جسم کے ایک ایک حصے تک پہنچتی ہے اور کس طرح اس غذا کا جو ہر اس کے جسم کا حصہ بن جاتا ہے؟ اس سارے عمل کے لیے پروردگار نے کس قدر عظیم الشان انتظامات کئے ہیں؟ اس میں اللہ تعالیٰ کی کس قدر حکمتیں اور تدابیر ہیں؟“

نوٹ: غذا کن مراحل سے گزر کر انسانی جسم کا حصہ بنتی ہے؟

مثلاً آپ بکری کا گوشت کھاتے ہیں تو یہ گوشت کچھ ہی دیر کے بعد انسان کا گوشت کس طرح بن جاتا ہے؟ وٹامن اے جوروٹی میں موجود ہوتی ہے کس طرح آنکھوں کو اس قابل بناتی ہے کہ انسان نیم تاریکی میں دیکھ سکے؟ کیا مادے (Matter) یا فطرت (Nature) میں یہ صلاحیت ہو سکتی ہے کہ اس قدر جیران کن اعضاء بنائے اور غذا کو جزو بدن بنانے کے لئے اس قدر پُر نیچ اور بے خطاء نظام تیار کرے؟

آئیے میڈیکل سائنس اور علم فعالیات کی مدد سے ایک سرسری سی نظر ڈالتے ہیں کہ جو غذا ہم

غذا کس طرح خونگوار ہوتی ہے؟

کھاتے ہیں اس کے لئے جسم کے کون کون سے اعضاء استعمال ہوتے ہیں اور کس طرح روٹی، گوشت، دودھ، پھلوں اور بزیوں پر مشتمل یہ غذا آخر کار ہمارے جسم کا حصہ بن جاتی ہے اور غذا کا فالتوحصہ اور اس کے استعمال کے دوران پیدا ہونے والے زہریلے مادے کس طرح اور کن ذرائع سے جسم سے خارج ہوتے ہیں۔

غذا کا مزے دار ہونا ضروری ہے

غذا کو استعمال کرنے میں سب سے پہلے تو ضروری ہے انسان کو بھوک محسوس ہو اور غذا کا کھا کر اسے مزہ آئے۔ اس مزے کو محسوس کرنے کے لئے ذاتوں کو محسوس کرنے والے مانگرو اسکو پک ابھارتالو، زبان اور حلق میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ ابھار ذاتیت کو اس وقت تک محسوس نہیں کرتے جب تک غذالعاب دہن (سلاسیوا) کے ساتھ دانتوں اور داڑھوں کے ذریعے گرینڈ ہونے یا پسند کے بعد کسی حد تک نیم سیال پیسٹ میں تبدیل نہ ہو جائے۔

اسی لئے کھانے کی کوئی بھی چیز آپ منہ میں رکھیں تو زبان اسے دانتوں اور پھر داڑھوں کے حوالے کر دیتی ہے۔ دانت اور داڑھیں اسے پیس کر پیسٹ کی شکل میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد زبان اس نواں کو اٹھا کر لہراتی ہے اور اس عمل کے ذریعے نواں کو حلق میں لے جاتی ہے۔

نوالہ نگلنے کا عمل

حلق کے نیچے غذا اور سانس کی دونالیاں ایک دوسرے کے قریب موجود ہیں۔ خطرہ موجود ہوتا ہے کہ یہ نوالہ کہیں اچانک آنے والی چھینک یا قھقہے کی وجہ سے سانس کی نالی میں نہ چلا جائے۔ اس خطرے کے تدارک کے لئے اللہ نے حلق کے اندر ایک ڈھکن بنایا ہے۔ اس ڈھکن کو اردو میں حلق کا کوکہا جاتا ہے۔

غذا کا نوالہ جب حلق میں کھلنے والے ناک کے سوراخوں کے نیچے سے گزر کر غذا کی طرف جا رہا ہوتا ہے تو حلق کا کو سانس لینے کے ان سوراخوں کو بند کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ اگر غذا سانس

کی نالی میں چلی جائے تو اپھو ہو سکتا ہے حتیٰ کہ اچانک موت تک واقع ہو سکتی ہے۔ منہ اور حلق ہر نوالے اور پانی کے ہر گھونٹ کو اسی نفاست کے ساتھ غذا کی نالی تک پہنچاتا رہتا ہے۔

غذا کا سفر

یہ غذا کئی مرحلوں سے گزر کر معدے میں پہنچتی ہے تو معدے کی اندر ونی تہہ جو تو لیے کی طرح ہوتی ہے فوراً، ہی دماغ کے حکم پر کچھ تیزابی مادے پیدا کرنے لگتی ہے اور معدہ اس نیم سیال کو ان تیزابی مادوں کے ساتھ ملا کر مزید باریک پیسٹ میں تبدیل کر دیتا ہے۔ ذرا، ہی دیر بعد معدہ اس پیسٹ کو چھوٹی آنت کے اندر داخل کرنا شروع کر دیتا ہے۔ معدہ صرف اتنے ہی غذائی مواد کو چھوٹی آنت میں داخل کرتا ہے جس قدر غذا پر چھوٹی آنت ایک وقت میں کام کر سکے۔

یہ غذا جب چھوٹی آنت میں داخل ہوتی ہے تو تیزابی مادے سے بھری ہوتی ہے۔ اگر یہ زیادہ دیر یہاں یونہی پڑی رہے تو یہ تیزابی مادے چھوٹی آنت میں السر (زم) پیدا کر سکتے ہیں۔ اسی لئے جیسے ہی یہ غذا یہاں پہنچتی ہے تو چھوٹی آنت فوراً، ہی ایک رطوبت خارج کرتی ہے۔ یہ رطوبت خون میں شامل ہو کر براہ راست آپ کے لبلے تک پہنچتی ہے۔

لبلہ اس پیغام کو سمجھ لیتا ہے اور فوراً، ہی ایک نمکین رطوبت پیدا کرنے لگتا ہے۔ یہ نمکین رطوبت چھوٹی آنت میں آکر گرنے لگتی ہے اور یہاں موجود غذا میں شامل تیزابی مادوں کے اثرات کو نیوٹرل (بے اثر) کر دیتی ہے۔

اسی طرح غذا کو قابل ہضم بنانے کے لئے ایک اور کیمیائی مادہ صfra (Bile) جگر میں تیار ہوتا ہے اور چھوٹی آنت میں آکر یہاں غذا میں موجود چکنائی کے بڑے ذرات کو چھوٹے ذرات میں تبدیل کر دیتا ہے۔

(جسم کے اعضاء کے درمیان ہم آہنگی کے بارے میں امام علیہ السلام نے جو فرمایا اسے ذہن میں رکھیے اور دیکھیے کہ آج سامنس اس قول کی تفسیر کس طرح بیان کر رہی ہے)

چھوٹی آنت میں اس کیمیائی عمل سے گزرنے کے بعد یہ غذائی مواد بڑی آنت میں پہنچتا

ہے۔ چھوٹی آنت سے بڑی آنت کے آخری سر تک آنتوں کی لمبائی 26 فٹ کے قریب ہوتی ہے۔ اس پورے راستے سے گزرتے وقت غذا کے ہاضمے اور اسے جزو بدن بنانے کے لئے مختلف مرحلوں میں کام جاری رہتا ہے۔

آخری مرحلے میں بڑی آنت اس غدائی پیٹ سے تمام پانی اپنے اندر جذب کر لیتی ہے جہاں سے یہ پانی دوبارہ دورانِ خون میں شامل ہو جاتا ہے۔ جب تمام پانی نکل جاتا ہے تو غدائی پیٹ میں موجود فاضل مادے نسبتاً ٹھوس حالت میں آ کر بڑی آنت کے آخری حصے میں جمع ہونے لگتے ہیں اور بالآخر مناسب وقت پر جسم سے باہر نکل جاتے ہیں۔

اس سے پہلے بڑی آنت کی اندر ورنی تھیہ اپنے مخصوص ابھاروں کی مدد سے غذا میں موجود جزو بدن بننے والے غدائی اجزاء کو اپنے اندر جذب کر کے انہیں پورے جسم میں پہنچا دیتی ہے۔ لحمیات (پروٹینز) اور نشاستے دورانِ خون میں شامل ہو کر جسم کے ایک ایک حصے تک پہنچتے ہیں اور چکنائی ایک اور نظام "لمف سسٹم" کے ذریعے پورے جسم کو فراہم کی جاتی ہے۔

(حوالہ از: جسم کے عجائب)

بھوک لگنا اللہ کا ایک احسان

بھوک لگنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ یہ اللہ کے عظیم احسانات میں سے ایک ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے ہمارے جسم کے اندر حیران کن انتظامات کئے ہیں۔ بھوک کی قدر و قیمت کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہیں بھوک نہ لگنے کا تجربہ ہو چکا ہو۔

بھوک لگنے سے پہلے، اس کے دوران اور بھوک ختم ہونے کے بعد ہمارے جسم میں بے شمار پُراسار و پیچیدہ انتظامات کئے جاتے ہیں۔ آپ کو کھانا کھلانے، اسے ہضم کرنے اور اسے جزو بدن بنانے کے اس عمل میں کتنے اعضاء، صلاحتیں، غددوں، کیمیائی مادے، کمیونی کیشن کے کس قدر عظیم الشان سلسلے اور جسم کے کس قدر خلیے اپنی خدمات پیش کرتے ہیں، آپ اس کا تصور کرنا بھی چاہیں تو نہیں کر سکتے۔

بھوک لگنے سے ذرا پہلے جسم کے اندر موجود مواصلاتی نظام جسم کے مختلف حصوں میں تو انائی کے کم ہونے کے بارے میں معلومات ہزاروں برقی کیمیائی سگنلز کے ذریعے دماغ کے ایک مخصوص حصے کو فراہم کرنا شروع کر دیتا ہے۔ دماغ کے اس حصے کو ہائی پو تھیلی مس کہا جاتا ہے۔

مثلاً برقی سگنلز کی شکل میں دماغ کے اس حصے تک جسم کے مختلف مقامات سے اطلاعات آتی ہیں کہ خون میں شوگر کی مقدار گرفتار ہی ہے۔ دوسری طرف سے اطلاع آتی ہے کہ تو انائی کے بحران کے سبب تھکن اور کمزوری کے ہلکے ہلکے اثرات پڑھوں پر محسوس ہو رہے ہیں۔

دماغ کا یہ مخصوص حصہ ان تمام معلومات کا تجزیہ کرتا ہے اور دماغ میں موجود ایک غدد (پیچوٹری گلینڈ) سے رابطہ میں رہتے ہوئے پورے جسم میں پھیلے ہوئے غدد اور اعضاء کو اپنے ہار موز کی مدد سے ہدایات فراہم کرنا شروع کر دیتا ہے۔ ان ہار موز کے ملته ہی منہ، زبان، حلق اور معدے تک جانے والی غذائی نالی میں موجود ہاضمے میں مد فراہم کرنے والے غدد اپنی پیداوار میں اضافہ کر دیتے ہیں۔

پر طوبت جسے سلائیوا (Saliva) کہا جاتا ہے، منہ سے لے کر حلق اور غذائی نالی تک پھیل جاتی ہے۔ زبان پر ذائقہ محسوس کرنے والے ابھاروں کی حساسیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے اس مرحلے پر گرم روٹی کی مہک یا سالن کی ہلکی سی خوشبو سے بھی ہمارے منہ میں پانی بھرا آتا ہے اور ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ اب بھوک ناقابل برداشت ہو رہی ہے۔

دماغ کے اس مخصوص حصے (ہائی پو تھیلی مس) کے دو مقامات سے کھانے پینے کے تمام معاملات کو کنٹرول کیا جاتا ہے۔ ان میں سے اگر ایک کسی سبب سے کام کرنا چھوڑ دے تو ہم کھاتے کھاتے تھک جائیں، پیٹ پھٹنے لگے، اس کے باوجود ہماری بھوک ختم نہیں ہوگی اور ہم مزید کھاتے چلے جائیں گے۔

دوسرے حصے میں کوئی خرابی پیدا ہو جائے تو ہمیں بھوک ہی نہیں لگے گی۔ زبان، منہ، حلق اور نظام ہضم کے دوسرے مقامات پر طوبت پیدا نہیں ہوگی۔ ایسی صورت میں زبردستی کھلایا بھی

غذا کس طرح خوشنگوار ہوتی ہے؟

جائے تو ایک نوالہ بھی حلق میں اتنا رنابے حدنا گوار کام ہو گا۔

(حوالہ از: جسم کے عجائب)

جسم کا نظام، خود بہ خود نہیں بن گیا

امام جعفر صادق علیہ السلام نے جسم کے اعضاء، ان کی ضرورت و اہمیت اور ان کی کارکردگی کی طرف متوجہ کرتے ہوئے مفضل ابن عمر سے فرمایا:

”ان اعضاء کی موجودگی اور ان کے افعال ثابت کرتے ہیں کہ یہ سارا جسمانی نظام کسی صاحبِ علم و حکمت ذات کا پیدا کیا ہوا ہے۔ جسم کے اعضاء اور ان کی تمام تر کارکردگی سب کچھ اس نظام کے تابع ہے جسے اللہ تعالیٰ نے جسم کے اندر پیدا کیا ہے۔“

غذا اور خون کی نالیاں

ہمارا ایمان ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام جسم انسانی کے بارے میں ان تمام حقائق سے آگاہ تھے جنہیں آج میڈیکل سائنس بیان کر رہی ہے یا ان پر مزید تحقیق میں مصروف ہے۔ لیکن آج سے بارہ تیرہ سو سال پہلے ان حقائق اور تفصیلات کو کسی شخص سے مختصرًا ہی بیان کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے کہ اس دور کا انسانی ذہن ان حقائق کی تفصیل کو سمجھنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اب ہم اس علمی محفوظ میں واپس چلتے ہیں جہاں امام جعفر صادقؑ اپنے شاگرد کو اثباتِ وجودِ خدا کے لازوال دلائل سے فیض یاب کر رہے ہیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے مفضل بن عمرؓ سے فرمایا:

”دیکھو! کھانا یا غذا جب معدہ میں پہنچ جاتی ہے تو معدہ اسے پکاتا ہے (اس کی کسی قدر تفصیل آپ گزشتہ باب میں ملاحظہ کر چکے ہیں)۔ معدہ اس غذاؤ کو قابل ہضم بنانے کے راستے سے (جگر کی طرف روانہ کر دیتا ہے۔ معدہ غذاؤ کو صاف کرنے کے لیے بنایا گیا ہے (معدہ اپنے تیزابی مادوں کے ذریعے غذا میں موجود تمام جراثیم کو ختم کر دیتا ہے) پھر جگر اس غذاء سے حاصل شدہ لب لباب (غذا کے جوہر) کو لے لیتا ہے۔

پھر یہ نہایت باریک حکمت سے (صاف شدہ حیاتیاتی اجزا سے بھر پور) خون بن جاتا ہے اور ان نالیوں (Artries) کے

ذریعے سارے جسم میں پہنچ جاتا ہے جو اس کام کے لیے بنائی گئی ہیں۔ جیسے (زراعت کے لیے) پانی کی نالیاں بنائی جاتی ہیں تاکہ پانی تمام زمین تک پہنچ جائے۔ غذا میں موجود فاضل مادے، گندی چیزیں (اور زہریلے مادے) ان مقامات کی طرف چلی جاتی ہیں جو مقامات ان فاضل مادوں کے جسم سے اخراج کے لیے بنائے گئے ہیں۔

نوٹ: جگر کا کردار

امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنی بات کو بہت مختصر کر کے بیان کیا ہے۔ اسی لیے آپ نے مختصر ایفہ فرمایا کہ جگر (Liver) غذا کے جو ہر کو لے لیتا ہے پھر یہ نہایت باریک حکمت سے خون بناتا ہے۔ اس فرمان کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ جگر ہی وہ عضو ہے جو جسم میں خون بننے یا اسے صاف کرنے میں بنا دی کردار ادا کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ جگر خون بناتا ہے بلکہ خون کو زندگی بخش بنانے میں جگر ایک بنا دی کردار ادا کرتا ہے۔ خون بنانے میں مرکزی کردار ہڈیوں کے گودے کا ہوتا ہے آئیے ایک نظر ڈالتے ہیں انسانی جگر کی کارکردگی پر.....

جگر (Liver) کے لیے کہا جاتا ہے کہ یہ ہماری زندگی اور صحت کے لیے پانچ سو سے زیادہ ایسی خدمات سر انجام دیتا ہے جن میں سے اگر چند خدمات جگر سر انجام دینا بند کر دے تو انسان کو اپنی وصیت تیار کر لینا چاہیے۔

اپنی بناوٹ اور پیچیدہ کارکردگی کی وجہ سے جگر کو دماغ کے سوا جسم کے تمام اعضاء پر برتری حاصل ہے۔ جگر ایک ایسا کیمیکل پلانٹ ہے جو اپنے اندر آنے والے خون میں شامل مہلک کیمیائی اجزاء کو ایک حیران کن عمل سے گزار کر انہیں جسم کے لئے قابلِ قبول بناتا ہے۔ یہ خون پہلے جگر میں جانے کی بجائے اگر دل میں چلا جائے تو منشوں میں انسان کی موت واقع ہو سکتی ہے۔

وہ کیمیائی مادہ جس کے سبب چوت لگنے کے بعد خون جنم جاتا ہے، اس کے اجزاء خون میں الگ الگ سفر کر رہے ہوتے ہیں۔ زخم لگتے ہی جگر دماغ کے حکم پر خون میں موجود ان اجزاء کو ایک جگہ جمع کر کے ایسا کیمیائی مادہ بناتا ہے جس کے سبب خون میں جنم کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ضرورت ختم ہونے کے بعد یہ اجزاء الگ الگ ہو کر خون میں سفر کرنے لگتے ہیں۔

بیماریوں کا مقابلہ کرنے والے اجزاء جنہیں اپنی باؤزیز کہا جاتا ہے، انہیں بھی وقت ضرورت جگر ہی تیار کر کے خون میں شامل کرتا ہے۔ خون کے مردہ خلیوں سے خون کے نئے خلیے بنانا بھی جگر ہی کی ذمہ داری ہے۔ روزانہ کی ضرورت کا صفرا (BILE) جو چربی کو ہضم کرنے میں مدد فراہم کرتی ہے، اسے جگر ہی تیار کرتا ہے۔

جسم کے اندر نمکیات کا توازن برقرار رکھنا اور توانائی کی پیداوار کے عمل میں بننے والے زہریلے مادہ لیکٹک ایسٹ (Lactic Acid) کو ایک پُر پیچ عمل سے گزار کر اسے گلوکوز میں تبدیل کرنا بھی جگر ہی کی ذمہ داری ہے۔ انسان کو زندہ، صحیت مند اور متھر کر رکھنے کے لیے کم و بیش ایک ہزار خامرے (Enzymes) تیار کرنا بھی جگر ہی کا کام ہے۔

خون کی نالیاں اور فاسد مادوں کا اخراج

عام آدمی خون کو سرخ رنگ کا ایک سیال سمجھتا ہے جو اس کے جسم میں موجود ہے اور زخم لگنے کی صورت میں اسے نظر آتا ہے۔ کوئی عام آدمی اندازہ ہی نہیں کر سکتا کہ یہ سیال مادہ کیا ہے، کن اجزاء سے کس طرح بنتا ہے اور کس طرح ہر انسان کو ایک منٹ میں 72 مرتبہ غذائی اجزاء کی فراہمی اور فاسد زہریلے مادوں کے جسم سے اخراج کی خدمات فراہم کرتا ہے۔

خون کے سرخ خلیوں کی تعداد کم و بیش 25 ارب ہوتی ہے۔ یہ 25 ارب سرخ خلیے جس سیال مادے میں سفر کرتے ہیں اسے پلازما (Plasma) کہا جاتا ہے۔ خون کے سرخ خلیے ہمارے پھیپھڑوں میں جا کر تازہ آکسیجن اپنے اندر جذب کرتے ہیں اور استعمال شدہ آکسیجن سے پیدا ہونے والی زہریلی گیس کاربن ڈائی آکسائیڈ کو پھیپھڑوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔

پھیپھڑے اس زہریلی گیس کو سانس کے ذریعے جسم سے خارج کرتے رہتے ہیں۔ خون کا پلازا مانندی اجزاء کو جسم کے ایک ایک خلیے تک پہنچانے کا ذمہ دار ہے۔

رگوں میں دوڑنے والا خون

امام علیہ السلام نے فرمایا:

”مفضل! کیا تم نے کبھی اپنے جسم کے اندر بہنے والے خون پر غور کیا؟ اور یہ سوچا کہ اس خون کو رگوں میں کس طرح بند رکھا گیا جس طرح پانی (جیسے آب حیات) کو کسی برتن میں رکھا جاتا ہے۔ رگوں میں بند رہنے سے یہ خون محفوظ رہتا ہے اور جسم میں ادھر ادھر (بے وجہ) بہہ نہیں پاتا۔“

نوٹ: حیران کن سائنسی انکشافات

غذائی اجزاء کا دوران خون کے ذریعے اعضاء تک پہنچنا اور فاضل مادوں کا خون سے نکل کر جسم سے خارج ہونے والے مقامات تک پہنچنا۔ خون کا خون کی نالیوں (یعنی شریانوں اور وریدوں) میں بند ہونا..... یہ سب ایسے حیران کن انکشافات ہیں جن کے بارے میں جزیرہ عرب ہی نہیں، یونان کے علمی معاشرے میں بھی کسی کو حتی طور پر کچھ معلوم نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ خون ہمارے جسم میں کسی لہر کی طرح سفر کرتا ہے۔

دورانِ خون کے جسم میں سفر کرنے کے نظام (Circulatory System) کے بارے میں حتی ثبوت 1628 صدی عیسوی میں برطانیہ کے ایک ڈاکٹر ولیم ہاروے (William Harvey) نے فراہم کیے کہ خون، شریانوں اور وریدوں کے ذریعے کس طرح پورے جسم میں سفر کرتا ہے۔ غذائی اجزاء اور فاسد مادوں کے جگہ کے ذریعے الگ الگ ہو کر جسم کے خلیوں اور

خصوص اعضاء تک پہنچنے کے بارے میں ماہرین حیاتیات کو 1930 عیسوی میں الیکٹران خرد بین کی ایجاد کے بعد معلومات حاصل ہونا شروع ہوئیں۔ (حوالہ از: How Body Work)

امام جعفر صادق علیہ السلام نے ان تمام سائنسی حقائق کو مغرب کی سائنسی ترقی سے صدیوں پہلے کم و بیش سن دو، ہجری یعنی آٹھویں صدی عیسوی میں بیان فرمایا جن کے بارے میں آپ سے صدیوں پہلے اور صدیوں بعد بھی اس کرہ ارض پر کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔

عام انسان خون کے ذریعے غذا کی فراہمی

جسم کا خون جسم کے اندر خون کی جن نالیوں (شریانوں اور ریڈوں) کے ذریعے سفر کرتا ہے، ان تمام شریانوں اور ریڈوں کو جسم سے نکال کر اگر ایک لائن میں رکھا جائے تو ان کی مجموعی لمبائی کم و بیش 75 ہزار میل بنتی ہے۔ یعنی انھیں کرہ ارض کے گرد تین مرتبہ پیٹا جا سکتا ہے۔

ہمارا دل ایک منٹ میں 72 مرتبہ دھڑکتا ہے اور ہر مرتبہ خون کی ایک خاص مقدار غذائی اجزاء کی ایک خاص مقدار لے کر دل سے جسم کی طرف سفر شروع کر دیتی ہے۔ خون کے سرخ خلیوں کی عمر 120 دن ہوتی ہے۔ آپ جتنی دیر میں پلک جھکتے ہیں اتنی دیر میں خون کے کم و بیش 12 لاکھ خلیے اپنی زندگی پوری کر کے مرجاتے ہیں لیکن اسی عرصے میں ہڈیوں کا گودا (Bone Marrow) خون کے اتنے ہی نئے سرخ خلیے دورانِ خون میں شامل کرتا رہتا ہے۔ دورانِ خون جسم کے ایک ایک عضو، ایک ایک خلیے تک اس کی ضرورت کی اشیاء پہنچاتا ہے لیکن جسم سے واپسی کے سفر میں یہ خون زہریلے اجزاء سے آلودہ ہو چکا ہوتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح کھیتوں کو دیا جانے والا پانی مختلف غلاضتوں کے ملنے سے گندا ہو جاتا ہے۔

آلودہ خون کی صفائی

اس خون کی صفائی جسم سے دل کی طرف واپسی میں ہوتی ہے۔ ہمارے گردے اس خون کو مسلسل صاف کرتے رہتے ہیں۔ اپنے گردوں کو آپ ڈائی لائی سرمشین سمجھ سکتے ہیں۔ ہمارا خون ان گردوں کے ذریعے ایک گھنٹے میں دو مرتبہ صاف کیا جاتا ہے۔ گردوں میں ایک بار یک چھلنیاں یک پھر: 1

موجود ہیں جو خون سے صرف فاسد اور غیر ضروری مادوں کو صاف کر کے اسے مثانے کی طرف بھیجتی رہتی ہیں۔ یہ فاضل اور زہریلے مادے مثانے میں جمع ہوتے رہتے ہیں اور آخر کار جسم سے خارج کر دیے جاتے ہیں۔

اعضاء اور نکاسی کا نظام

امام علیہ السلام نے فرمایا:

تو مفضل! دیکھو اور غور کرو کہ جسم انسانی کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی شان خلاقیت کی کیسی کیسی عظیم نشانیاں موجود ہیں۔ دیکھو کہ یہ تمام اعضاء کس طرح جسم میں اپنے لیے انتہائی مناسب مقامات پر تخلیق کیے گئے۔ یہ ظروف (آنٹی، گردے اور مثانہ) کس طرح تخلیق پائے کہ یہ اپنے اندر فضلے (فاسد مادوں) کو جمع کریں۔ انہیں جسم کے باقی حصوں میں نہ پھینے دیں۔ اگر یہ فضلے جسم کے دوسرے حصوں میں پھیل جائیں تو جسم میں بیماریاں پیدا ہو جائیں گی۔

تو کیا ایک بے جان مادے اور بے شعور طبیعت (Nature) کے لیے یہ ممکن تھا کہ جسم انسانی کو اس باریک بینی اور حکمت و مصلحت کے ساتھ تخلیق کرے۔

لپس مبارک ہے وہ ذات جس نے اس قدر اچھے انداز اور محکم تدبیر کے ساتھ ان اعضاء کو پیدا کیا۔ اس کے لیے وہ حمد و

ثناء ہے جس کا وہ مستحق ہے اور جس کا وہ سزاوار ہے۔ الحمد للہ رب العالمین۔

مفضل بن عمرؓ نے بھی بے ساختہ ”الحمد للہ رب العالمین“ کہا اور عرض کی:
”آقا! اب آپ مجھے جسم کی نشوونما کے بارے میں بتائیے۔ یہ نشوونما جسم کے مکمل ہونے تک کس طرح جاری رہتی ہے۔ اس کے بارے میں فرمائیے!“

.....
جسم کی نشوونما کے راز کو ماہرین حیاتیات نے صحیح معنوں میں انیسویں صدی کے نصف آخر میں DNA کی دریافت کے بعد سمجھا۔ جبکہ امام علیہ السلام نے اس حوالہ سے اس سے ہزار سال پہلے جو کچھ فرمایا، وہ حیران کن ہے۔ اس حوالے سے تفصیلات اگلے باب میں ملاحظہ فرمائیں۔

باب: 8

جسم کی نشوونما

اس علمی نشست میں مفضل بن عمرؓ نے امام علیہ السلام سے ایک سوال کیا تھا۔ انہوں نے پوچھا تھا کہ آپ مجھے انسانی جسم کی نشوونما کے بارے میں بتائیے کہ جسم کس طرح بڑھتا رہتا ہے اور جسم کے مکمل ہونے تک یہ عمل کس طرح جاری رہتا ہے؟

امام علیہ السلام نے مفضل بن عمرؓ سے اس بارے میں جو کچھ فرمایا اس کے بارے میں اس سے پہلے اس وقت کے علمی مراکز مثلاً یونان، ہندوستان، مصر اور چین کے فلسفی، حکیم اور دانشور بھی جتنی طور پر کچھ نہیں جانتے تھے اور جو کچھ جانتے تھے وہ بھی بیشتر ناقص معلومات پر مبنی تھا۔ مغرب کے سائنس دانوں نے بھی امام علیہ السلام کے دور سے کم و بیش ہزار سال کے بعد جسم انسانی کے ان اسرار اور موز کو سمجھنا شروع کیا۔

جسم کی تعمیر

امام جعفر صادق علیہ السلام نے مفضل بن عمرؓ کے سوال کے جواب میں فرمایا:

”دیکھو مفضل!“ انسانی جسم کی نشوونما کے آغاز کا پہلا مرحلہ تو رحم مادر میں مکمل ہوتا ہے (یہ باراً اور خلیہ رحم مادر کی دیوار سے چپکتا ہے جب مرد کا تولیدی خلیہ عورت کے تولیدی خلیے سے ملتا ہے)۔

اس مرحلے میں نہ انسانی آنکھ اسے دیکھ سکتی ہے اور نہ کسی کا ہاتھ اس تک پہنچ سکتا ہے اور پھر اس کی ”تدبیر“ ہوتی رہتی ہے۔

یہاں تک کہ اس کے تمام اعضاء و جوارج جو ترکیب بدن میں شامل ہیں، تیار ہو جاتے ہیں۔ مثلاً دل، جگر، معدہ، ہڈیاں،

گوشت، چربی، مغز، رگیں، پٹھے وغیرہ۔ جب یہ سب کارکن اعضاء تیار ہو جاتے ہیں تو انسان اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے۔

”پھر تم دیکھتے ہی ہو کہ پیدا ہونے کے بعد اس کے اعضاء کس طرح خود بے خود ایک نظام کے تحت نشوونما حاصل کرتے رہتے ہیں۔ غور کرو کہ اعضاء تو بڑھتے رہتے ہیں لیکن اس کا جسم اپنی خاص ہیئت پر برقرار رہتا ہے۔ اس کے بدن میں کوئی ٹوٹ پھوٹ نہیں ہوتی۔ نہ کوئی چیز اس میں باہر سے جوڑی جاتی ہے اور نہ نکالی جاتی ہے جس سے یہ سمجھا جائے کہ جسم میں کہیں کوئی پیوند لگایا گیا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی پختگی تک پہنچ جاتا ہے، چاہے اس کی عمر دراز ہو یا وہ اپنی مدتِ عمر اس سے پہلے ہی پوری کر لے۔

تو کیا یہ انسانی جسم کی حیران کن نشوونما اللہ کا انکار کرنے والوں کو سمجھانے کے لیے کافی نہیں ہے؟ کیا بے حس اور بے روح ماڈے یا طبیعت (یعنی نیچر) میں یہ صلاحیت ہو سکتی ہے کہ وہ انسان کی تخلیق کے لیے اس قدر باریک تر کیب (منصوبے) اور حکمت سے کام کر سکے؟“

نوٹ: تدبیر سے کیا مراد ہے؟

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: ”پھر اس کی تدبیر ہوتی رہتی ہے“۔ اس ایک لفظ ”تدبیر“ کی تشریع کرنا علمائے حیاتیات کا کام ہے۔ اس ایک لفظ کی سائنسی تفسیر کے لیے ہزاروں

کتابیں تحریر کی جا چکی ہیں لیکن اس کے باوجود ماہرین حیاتیات یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ وہ سب کچھ جان پکے ہیں۔ ہم اس لفظ مذہبیر کی مختصر تشریح بیان کریں گے۔

ماہرین حیاتیات 19 ویں صدی کے نصف آخوندک اس تجسس کا شکار رہے کہ یہ انسانی جسم رحم مادر میں آخر کس طرح تشکیل پاتا ہے؟ کس طرح ایک نہاسا خلیہ ایک جیتے جا گتے انسان میں تبدیل ہو جاتا ہے؟ سارا جسم اور اس کے اعضاء مثلاً ہاتھ پیر، ہڈیاں، کھوپڑی، آنکھ، کان، ناک، یہ سب اعضاء ایک مرحلے پر آنے کے بعد بڑھنا کیوں رُک جاتے ہیں۔ سر کے بال بڑھتے رہتے ہیں لیکن پلکوں کے بال ایک مرحلے پر ٹھہر کیوں جاتے ہیں؟ بچوں کی شکل اپنے والدین سے کیوں مشابہ ہوتی ہے؟ بالوں اور آنکھوں کا رنگ ہر شخص میں الگ الگ کیوں ہوتا ہے؟ یہ اور اسی طرح کے ہزاروں سوال تھے جن کا جواب 1930ء میں الیکٹران خرد بین کے اور پھر 1953ء میں DNA کی دریافت کے بعد سائنس دانوں کی سمجھ میں آنا شروع ہوا۔ 1953ء میں دو امریکی سائنس دانوں فرانس کرک اور جیمس وائسن نے جسم کے خلیوں میں DNA نامی مالکیوں دریافت کر لیا۔

مالکیوں کئی ایٹم (ذرات) کے ملنے سے وجود میں آتا ہے۔ ہمارا سارا جسم انہی ایٹموں، مالکیوں اور خلیوں سے مل کر بنتا ہے۔ DNA نامی مالکیوں پر مزید تحقیق و تجربات کے بعد معلوم ہوا کہ اس مالکیوں کی شکل ایک دوسرے پر لپٹے ہوئے دو دھاگوں کی طرح ہوتی ہے۔ اس دھاگے پر ماں اور باپ یعنی نہیاں اور دھیاں کی تمام تر خوبیاں، خامیاں اور خصوصیات کیمیائی کوڈز کی صورت میں موجود ہوتی ہیں۔ انہی کوڈز کو بعد میں جینز Genes کا نام دیا گیا اور اسی سے Genetics یعنی علم جینیات وجود میں آیا۔

جسم اور اس کے اعضاء

اگر ہم اپنے جسم کی تعمیر کا جائزہ لیں تو اس کی ترتیب یا ترتیب اس طرح ہوگی:

1۔ بہت سے ایٹم مل کر مالکیوں بناتے ہیں۔

- 2- مالکیوں کے مجموعے سے آر گے نلس (Organells) بنتے ہیں۔ یہ خلیے (Cell) کے اجزاء ہوتے ہیں۔ (ہمارے جسم میں کم و بیش 100 کھرب (ٹریلیون) خلیے پائے جاتے ہیں)
 - 3- آر گے نلس مل کر خلیے کی تشکیل کرتے ہیں۔
 - 4- بہت سے خلیوں کے ملنے سے جسم کے بافتے (Tissues) بنتے ہیں۔
 - 5- بافتوں کے مجموعے سے عضو (مثلاً جگر) بناتا ہے۔
 - 6- کئی عضوں کر جسم کا ایک نظام (مثلاً منہ، آنٹی، معدہ) بناتے ہیں۔
 - 7- مختلف نظاموں کے ملنے سے انسانی جسم کامل شکل اختیار کرتا ہے۔
- (انسان کے 5 حواس ہیں۔ پورے جسم کے اندر کل 12 نظام پائے جاتے ہیں جن میں سے کسی ایک کے بغیر بھی زندگی ممکن نہیں ہے۔ اسی طرح پیچوڑی گلینڈ سے 12 ہارمون خارج ہوتے ہیں جو پورے انسانی جسم اور اس کی کارکردگی کو کنٹرول کرتے ہیں)۔

(How Body Works:)

غیب کی دنیا

DNA دراصل Deoxyribo Nucleic Acid کا مخفف ہے اور یہ کیمیکل خلیے میں پایا جاتا ہے۔ خلیہ کتنا بڑا ہوتا اس کا اندازہ آپ اس طرح کر سکتے ہیں کہ اس تحریر کے دو الفاظ کے درمیانی جگہ میں کم و بیش پانچ لاکھ خلیے بہ آسانی سما سکتے ہیں۔ اس ناقابل بصارت اور ناقابل تصور سائز کے ہر خلیے میں DNA، چھ سو خامرے، ایک ہزار تو انائی گھر اور بہت سے دوسرے نظام بھی پائے جاتے ہیں۔

DNA خون کے سرخ خلیوں کے سوا جسم کے ہر خلیے میں پایا جاتا ہے۔ DNA کے دو دھاگوں کو نکال کر ایک لائے میں رکھا جائے تو یہ لمبائی دو میٹر کے قریب ہوتی ہے۔ اگر جسم کے تمام خلیوں سے DNA کے دھاگوں کو نکال کر ایک لائے میں رکھا جائے تو یہ لمبائی زمین اور چاند کے درمیانی فاصلے سے دس ہزار گنازیادہ ہوگی۔

ان دہرے کمانی دار دھاگوں کو ڈبل ہیلیکس (Double Helix) کہا جاتا ہے۔ ان دھاگوں پر ماں اور باپ کی تمام تر خصوصیات کیمیائی کوڈز کی شکل میں موجود ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک دھاگا باپ کی طرف سے ہوتا ہے اور ایک ماں کی طرف سے۔ DNA پر وہ تمام تفصیلات پائی جاتی ہیں جن کی مدد سے ایک نحاسا خلیہ ایک مکمل انسان میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

یہ ہدایات کوڈز کی شکل میں ہوتی ہیں اور یہ کوڈز صرف چار کیمیکلز پر مشتمل ہوتے ہیں۔ لیکن ان چار کیمیکلز میں سے کسی بھی تین کیمیکلز کے ملنے سے ہزاروں لاکھوں ہدایات بنتی ہیں۔ مثلاً بچے کا جسم کس طرح تعمیر ہو گا، کون سا عضو کہاں لگے گا۔ جسمانی ساخت، صحت، رنگ، چال، ڈھال، قد، قامت، آواز، لہجہ، بالوں، جلد، بالوں اور آنکھوں کا رنگ کیسا ہو گا۔ ماں باپ، دادا دادی، نانا نانی، کی طرف سے آنے والی کون کون سی خصوصیات اس بچے میں آئیں گی اور کون سی اگلی سلوں میں منتقل ہوں گی۔ کس عمر میں اسے کون سی بیماریاں لاحق ہوں گی۔ جسم کو تا حیات زندہ و برقرار رکھنے کے لیے جسم کے نظاموں کو کیا اور کس طرح کرنا ہو گا، جسم کی تعمیر میں استعمال ہونے والا خام مال کہاں سے کب، کتنا اور کس طرح آئے گا اور یہ کب کس طرح اور کہاں استعمال ہو گا۔

”وہی تو وہ خدا ہے جو رحم مادر میں تمہاری صورت جیسی چاہتا ہے بناتا ہے۔ اس کے سوا کوئی معبوڈ نہیں۔ وہی رب (اور) دانا ہے۔“ سورہ آل عمران آیت نمبر ۶۔

یہ سب تفصیلات، پروگرام، منصوبہ یا پلان DNA پر موجود ہوتا ہے اور زندگی کے آغاز کے ساتھ ہی یہ ہدایات ایک سے دوسرے خلیے میں منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ جسم کے سارے اعضاء اور نظاموں کی تعمیر اسی نقشے کے مطابق ہوتی ہے اور نو ماہ یا اس سے کم مدت میں ایک انسان نوزاںیدہ بچے کی صورت میں دنیا میں آنکھ کھولتا ہے۔ اس کے بعد بھی اس کے نشوونما کے تمام مدارج ہر خلیے میں موجود DNA کے پروگرام اور اس کے حکم کے مطابق ہی سرانجام پاتے ہیں۔

دلچسپ اور حیران کن بات یہ ہے کہ نہ یہ باراً ورخلیہ انسانی آنکھ کو نظر آتا ہے اور نہ DNA

کے نظام تک کسی کی بصارت پہنچ سکتی ہے۔ خلیے جو ہر عضو کا بہت چھوٹا یونٹ ہوتے ہیں انہیں بھی آنکھ سے نہیں دیکھا جاسکتا۔ DNA کے دھاگوں کو بھی دیکھنے کے لیے الیکٹران خرد بین درکار ہوتی ہے۔

یہ سارا نظام جہاں زندگی اور موت کے فیصلے ہوتے ہیں سب عالم غیب میں رہتا ہے اور کسی کی مداخلت کے بغیر اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق انسانوں اور دوسرے ذی حیات کی تعمیر کرتا ہے، انہیں صحت مندرجہ ہے اور نارمل زندگی گزارنے میں ان کی مدد کرتا ہے۔

DNA خلیے جسم کی پوری مملکت کا ایک سخت گیر منتظم ہوتا ہے۔ تمام خلیے مجبور ہوتے ہیں کہ DNA کے احکامات پر عمل کریں۔

چیک اینڈ بیلنس

1970ء میں ماہرین نے دیکھا کہ جب DNA اپنی کاپی کاپی دوسرے خلیے میں منتقل کر رہا ہوتا ہے تو اچانک ہی ایک خاص مادہ منتقلی کے اس عمل میں مداخلت کرتا نظر آتا ہے۔ ان ٹرون نامی اس مادے کو ابتداء میں ایک اتفاقی واقعہ سمجھا گیا لیکن بعد کی تحقیق سے یہ بات سامنے آئی کہ انٹرون (intron) ڈی این اے کے چیک اینڈ بیلنس کا حصہ ہے اور اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ جینز (وراثتی خصوصیات) کی ایک خلیے سے دوسرے خلیے میں منتقلی کے عمل میں کوئی خرابی پیدا نہ ہو اور جینز (Genes) بالکل درست انداز میں دوسرے خلیے میں منتقل ہو جائیں۔

ذی حیات کی تخلیق و تشكیل کے لیے اللہ تعالیٰ پرده غیب میں اس قدر عظیم الشان انتظامات نہ کرے تو ممکن ہے انسانوں کے کانوں کی جگہ سینگ نکل آئیں۔ ناک لمبی ہو کر سینے تک لٹک جائے۔ تتمیاں رنگ بکھیرنے کی بجائے زہر میلے حشرات میں تبدیل ہو جائیں۔ وہیل خشکی پر نکل آئیں اور صحرائی اونٹ سمندر کی تہوں میں جا کر زندگی گزارنا شروع کر دیں۔

(حوالہ: DNA۔ جسم کی کتاب ہدایت)

نوت: قبل از وقت موت

امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنی گفتگو میں ایک حیران کن بات یہ بھی بتائی کہ ”خواہ اس کی عمر دراز ہو یا وہ اپنی مدتِ حیات اس سے پہلے ہی ختم کر لے۔“ امام نے یہ فرمایا کہ ایک حیران کن سائنسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ آئیے اس جملے کو میدی یکل سائنس کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔

ہماری گردن پر سامنے کی جانب ایک غدود (Gland) پایا جاتا ہے۔ اس گلینڈ کو تھائی رائیڈ گلینڈ کہا جاتا ہے۔ تھائی رائیڈ جسم کو حاصل ہونے والی توانائی کو اعتدال کے ساتھ خرچ کرنے کا ذمہ دار ہے۔ جسم میں موجود توانائی کو ضرورت کے مطابق خرچ کرتا ہے لیکن اس میں اگر کوئی خرابی پیدا ہو جائے تو جسم میں موجود توانائی تیزی سے خرچ ہونے لگتی ہے۔

اس کی وجہ سے انسان سب کچھ کھانے پینے کے باوجود بھی بہت جلد موت کا شکار ہو سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح چراغ کی لومہ ہم رکھی جائے تو وہ صبح تک جل سکتا ہے۔ اگر اس کی لو بڑھادی جائے تو وہ اپنی توانائی تیزی سے خرچ کر کے بہت جلدی بجھ جاتا ہے۔

اس کے علاوہ زندگی حادثات سے بھری ہوئی ہے۔ انسان کی عمر مثلاً 80 سال ہے لیکن اگر وہ تمیں سال کی عمر میں نشہ استعمال کرنا شروع کر دے تو زندگی بہت جلد ختم ہو سکتی ہے۔ عمر دراز ہونے کے باوجود ممکن ہے کوئی شخص حالات سے گھبرا کر خود کشی کر لے یا غیر محتاط ڈرائیونگ کے سبب موت کا شکار ہو جائے۔ زلزلے، حادثات اور باقی امراض سے ہونے والی اموات بھی اس کی ایک مثال ہیں۔

اعضاء خود کا راندہ از میں کام کرتے ہیں

آپ غور فرمائیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ جسم کے بیشتر افعال میں آپ کا کوئی کردار نہیں ہوتا۔ مثلاً سانس لینا اور دل کا دھڑکنا خود بہ خود جاری رہتا ہے، گردے اور جگر ہماری کوشش کے بغیر کام کرتے ہیں، آنکھیں ہمیں خود بہ خود راہ دکھاتی ہیں، کان سناتے ہیں، ناک سنگھاتی ہے، خون خود بہ خود جسم میں سفر کرتا ہے، غذا ایک خود کا ر نظام کے تحت جزو بدن بنتی رہتی ہے اور جسم کی غلطیں

ایک خودکار نظام کے تحت جسم سے نکلتی ہیں۔

یہ سب کام اگر ہمیں خود اپنے ارادے اور اپنی کوشش سے کرنا پڑتے تو ہماری زندگی انہتائی تلخ، ناگوار اور بہت مختصر ہوا کرتی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے جسم کے اندر ہی ایک خودکار نظام قائم کیا کہ ہم ناگواری اور مشکل سے بچ رہیں اور یکسوئی کے ساتھ وہ کام کر سکیں جن کا اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے۔

امام علیہ السلام کے صرف ایک جملے کی کسی قدر تفصیل ہم نے آپ کے لیے بیان کی تاکہ ہمارے قارئین امام علیہ السلام کے کلام کو گہرائی کے ساتھ سمجھ سکیں اور لذت شکر میں ہمارے ساتھ شریک ہو سکیں۔ (اگر آپ DNA کے بارے میں تفصیل سے جانا چاہیں تو ہماری کتاب ”جسم کی کتاب ہدایت“ کا مطالعہ کریں۔)

عظیم فضیلت جو صرف انسان کو عطا کی گئی

امام جعفر صادق علیہ السلام نے انسانی جسم کی نشوونما اور اس کے حیران کن انتظامات پر گفتگو کرنے کے بعد مفضل ابن عمرؓ کو اس فضیلت کی طرف متوجہ فرمایا جو انسانی جسم کے سوا کسی دوسرے ذی حیات کے جسم میں نہیں پائی جاتی۔

امام علیہ السلام نے فرمایا:

”مفضل! کیا تم نے کبھی غور کیا کہ انسان کو اپنی خلقت یعنی جسم کی بناؤٹ میں دوسرے تمام جانداروں کی نسبت جو عظیم فضیلت حاصل ہے، وہ اس کا دو پاؤں پر سیدھے ہو کر کھڑا ہونا ہے۔ یہ صلاحیت دوسرے ذی حیات مثلًا پرندوں، درندوں چوپالیوں اور دودھ پلانے والے جانداروں کو (اس معیار کی) حاصل نہیں ہے۔

یہ ایک عظیم صلاحیت اللہ کا ایک عظیم احسان ہے جو پروردگار نے انسانوں پر کیا ہے لیکن لوگ اس کی عظمت و اہمیت پر غور نہیں کرتے۔

اپنی اس منفرد صلاحیت کے سبب انسان سیدھا کھڑا ہو سکتا ہے اور اپنے دونوں ہاتھوں کی مدد سے ہزاروں طرح کے کام سرانجام دے سکتا ہے۔ دوسرے جاندار چاروں ہاتھوں پیروں کی مدد سے چلتے ہیں جب کہ انسان دو پیروں سے چلتا پھرتا ہے اور دو

ہاتھوں کی مدد سے کام کرتا ہے۔ اگر انسان کو بھی دوسرے چوپایوں کی طرح (زو بہ زمین) خلق کیا گیا ہوتا تو ہاتھوں سے کسی بھی قسم کا کام کرنا اس کے لئے ممکن نہ ہوتا۔“

نوٹ: ریڑھ کی ہڈی.....قدرت کی انجینئرنگ کا عظیم شاہکار

دوسرے جانداروں کی نسبت انسان کے لئے سیدھے کھڑے ہو کر دو پیروں سے چلنا دراصل اس کی ریڑھ کی ہڈی کی حیران کن ساخت کے سبب ممکن ہوتا ہے۔

آئیے ایک نظر ڈالیں کہ یہ ریڑھ کی ہڈی ہے کیا؟ اس کی بناؤٹ کس طرح دوسرے جانداروں کی ریڑھ کی ہڈی سے مختلف ہے؟ اور یہ ہمارے لئے، ہماری زندگی کے لئے اور زندگی کے ہر لمحے میں ہزاروں لاکھوں کاموں کو سرانجام دینے میں ہماری کس طرح مدد کرتی ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ ہماری ریڑھ کی ہڈی قدرت کی انجینئرنگ کا ایک بالکل منفرد اور حیران کن شاہکار ہے۔ آج جو انسان سراٹھا کر، سینہ تان کر، دو پیروں پر کھڑا ہوتا ہے تو یہ اللہ کے اس احسان کے سبب ہے جو اللہ تعالیٰ نے صرف انسانوں پر کیا ہے اور وہ احسان ہے ہماری ریڑھ کی ہڈی۔

دوسرے جانداروں مثلاً گائے بھینس، گھوڑے، بکری بھیڑ وغیرہ کی ریڑھ کی ہڈیاں چھپت کو سہارا دینے والے شہتیر کی طرح ہوتی ہیں اسی لیے یہ جانور دوپاؤں پر سیدھے نہیں کھڑے ہو سکتے جب کہ ہماری ریڑھ کی ہڈی ہمیں جھکنے مڑنے، سیدھا کھڑا ہونے اور گردن کو 180 زاویوں پر گھمانے میں ہر روز لاکھوں مرتبہ ہماری مدد کرتی ہے۔

چلیں دوسرے کاموں کو چھوڑیں، صرف نماز ہی کی مثال لے لیں۔ وضو، قیام، رکوع، سجدے اور پھر سجدے سے اٹھنے میں، دعا کے لئے ہاتھ بلند کرنے میں ریڑھ کی ہڈی کس طرح اور کن کن زاویوں سے ہماری مدد کرتی ہے۔ یہ ریڑھ کی ہڈی پورے جسم کا بوجھ برداشت کرنے کے ساتھ ساتھ ہمارے سر اور گردن کا بوجھ بھی اٹھاتی ہے۔ (اب اگر ہم نماز کے دوسرے سجدے

کے بعد اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہتے ہیں ”بِحَوْلِ اللَّهِ وَ قُوَّتِهِ وَاقُومٌ وَاقِعُونَ“ تو یہ کس قدر مناسب حال حمد ہے!

اعصابی نظام

جسم اور دماغ کے درمیان رابطے کا پورا نظام ریڑھ کی ہڈی کے درمیان سے گزرتا ہے۔ کیونی کیشن کا یہ نظام ایک موٹے کیبل (Cable) کی شکل میں ریڑھ کی ہڈی کے مہروں کے درمیان سے ہوتا ہوا دماغ میں جاتا ہے۔ اسے اسپائینل کورڈ (Spinal Cord) کہا جاتا ہے۔ اس ”کیبل“ کے اندر ہزاروں لاکھوں تار (ریشے) موجود ہوتے ہیں۔ یہ ریشے ہمارے اعصابی نظام کا حصہ ہیں۔

یہ اعصاب پیر کے ناخن سے کھوپڑی تک ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔ ہر لمحہ جسم سے دماغ اور دماغ سے جسم کے مختلف حصوں تک لاکھوں، کھربوں پیغامات اسی اعصابی نظام کے ذریعے سفر کرتے ہیں۔ جسم دماغ کو ہر لمحے ہزاروں نت نئی اطلاعات فراہم کرتا رہتا ہے اور دماغ ان اطلاعات کی بنیاد پر نئی حکمت عملی طے کرتا اور نئے احکامات جاری کرتا رہتا ہے۔ اگر اطلاعات و احکامات کا یہ مواصلاتی نظام اور اس کے ذریعے جسم و دماغ کا باہمی رابطہ کسی سبب سے منقطع ہو جائے تو جسم کے نادر و نایاب اعضاء، آلات، پیچیدہ مشینیں اور پراسرار کارخانے ایک لمحے میں ناکارہ ہو جائیں اور انسان لمحہ بھر میں ساکت، بے جان، بے حس ہو کر زمین کے بوجھ میں تبدیل ہو جائے۔

ریڑھ کی ہڈی کی بناوٹ

اگر آپ ریڑھ کی ہڈی کی بناوٹ کا معاشرہ کریں تو قدرت کی اس اعلیٰ ٹیکنالوجی کو دیکھ کر حیران رہ جائیں گے۔ ریڑھ کی ہڈی ایک نہیں بلکہ بہت سے مہروں کا مجموعہ ہے۔ گردن کے اوپر سے شروع ہونے والے سات مہروں کو سرداری کل (Cervical) کہا جاتا ہے۔ یہ مہرے آپ کو اس قابل بناتے ہیں کہ آپ اپنی گردن کو 180 زاویوں پر گھما سکیں۔ سر کا وزن سن بھالنے کا کام بھی یہی مہرے سر انجام دیتے ہیں۔

درمیان کے مہروں کو تھوروسک (Thorasic) کہا جاتا ہے ان کی تعداد بارہ ہوتی ہے۔ یہ

آپ کی پسلیوں سے جڑے ہوتے ہیں۔ انہیں زیادہ حرکت کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

ان کے نیچے ریڑھ کی ہڈی کے آخری پانچ مہرے ہوتے ہیں۔ یہ بے حد مضبوط بنائے گئے ہیں۔ جسم کا وزن سنہالنا انہی مہروں کی ذمہ داری ہے۔ انہیں لمبر (Lumber) کہا جاتا ہے۔ ان کے آخر میں خاص ہڈی ہے جو پانچ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے مہروں سے بنی ہے۔

بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو اس وقت اس کی ریڑھ کی ہڈی تقریباً سیدھی ہوتی ہے۔ جب بچے کا ہلتا ہوا سر ٹھہرتا ہے تو گردن کے اوپر والے مہروں میں بھی ذرا سالم پیدا ہو چکا ہوتا ہے۔ جب بچہ گھٹنیوں کے بل چلنے شروع کرتا ہے تو درمیان والے مہروں میں ذرا سا ابھار آ جاتا ہے۔ اس طرح ریڑھ کی ہڈی بتدرنج لہراتی ہوئی رسی کی شکل کی ہو جاتی ہے۔

اس میں اللہ تعالیٰ کی عظیم مصلحتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ اس لیے کہ اگر ریڑھ کی ہڈی بالکل سیدھی رہتی تو جھٹکوں کو برداشت نہیں کر سکتی تھی اور کسی بھی دن درمیان سے چٹ جاتی۔ لیکن یہ اپنے اندر پیدا ہونے والے خم اور لپک کی وجہ سے جھٹکوں کو برداشت کرنے کی کئی گناہ زیادہ صلاحیت حاصل کر لیتی ہے۔

ریڑھ کی ہڈی کے جن مہروں کا ہم نے تذکرہ کیا، ان میں سے ہر دو مہروں کے درمیان چینی ہڈی سے بننے ہوئے پیڈ یا نرم گدیاں ہوتی ہیں۔ ان پیڈ زکوڈسکس (Discs) کہا جاتا ہے۔ یہ پیڈ اوپر سے کان کی لو جیسے ہوتے ہیں اور ان کے اندر جیلی جیسا مادہ بھرا ہوتا ہے۔ یہ پیڈ ز اور جیلی جیسا مادہ مہروں کو ایک دوسرے سے ٹکرانے سے محفوظ رکھتا ہے۔ اگر کسی بڑے جھٹکے یا حادثے کی وجہ سے ان میں سے کوئی پیڈ پھٹ جائے تو وہ انسان چلنے پھرنے سے محروم ہو سکتا ہے۔

آج انسانوں کی دوسرے ذی حیات پروفیشن، تمام سائنسی ترقی، ٹیکنالوجی کے تمام کارنامے، علم و ادب اور آرٹ کے سارے نمونے، طرز تعمیر کے سارے عظیم شاہکار، طرح طرح کی سواریاں، عالیشان سڑکیں اور راستے، صنعت و حرفت، کھیتی باڑی، کرۂ آلبی سے دوسرے سیاروں تک رسائی

عظمیں فضیلت جو صرف انسان کو عطا کی گئی ہے

..... یہ سب چیزیں انسان کے اندر پائی جانے والی ریڑھ کی ہڈی کی مر ہون منت ہیں۔ اگر انسان کی ریڑھ کی ہڈی بھی دوسرے حیوانوں، چوپالیوں کی طرح ہوتی تو انسان کا جسمانی طور پر اشرف المخلوقات کے درجے پر بلند ہونا کسی بھی طرح ممکن نہیں تھا۔ (حوالہ از: جسم کے عجائب)

حواسوں کی ضرورت

اس کے بعد امام علیہ السلام نے مفضل ابن عمرؓ کو انسانی جسم میں موجود حاسوں مثلاً آنکھ، ناک، کان، زبان اور جلد میں موجود حساس اعصابی نظام کی طرف متوجہ فرمایا۔ آپ نے کہا:

”مفضل! اب ذرا ان حاسوں پر غور کرو جو آدمی کے جسم میں پیدا کیے گئے اور ان کے ذریعے انسان کو عز و شرف عطا کیا گیا۔
دوسرے جانداروں کو ان حاسوں (اعضاء) کے سبب وہ عز و شرف حاصل نہیں جو انسانوں کو حاصل ہوتا ہے۔“

(یہ حاسے دوسرے جانداروں میں بھی پائے جاتے ہیں لیکن انسانی جسم میں ان کی کارکردگی کا معیار دوسرے ذی حیات کے مقابلے میں بے حد ترقی یافتہ اور جدید ہے)

آنکھیں سر میں کیوں بنائی گئیں

امام علیہ السلام نے فرمایا:
”مثلاً ذرا آنکھوں ہی پر غور کرو کہ آنکھیں کس طرح جسم کے ایک خاص مقام پر بنائی گئیں۔“

(اگر جسم انسانی کا کوئی خالق نہ ہوتا، اس کی تعمیر کے پیچھے ایک خاص پروگرام یا منصوبہ نہ ہوتا، یہ خود بے خود پیدا ہو گیا ہوتا تو کسی شخص کا کوئی عضو جسم کے کسی مقام پر ہوتا اور کسی کا وہی عضو کسی اور مقام پر پایا جاتا)

امام علیہ السلام نے فرمایا:

”دیکھو! یہ آنکھیں جسم کے سب سے بلند اور مناسب مقام پر بنائی گئیں اور سامنے کی طرف بنائی گئیں۔ جس طرح چراغ دان میں چراغ رکھا ہوتا ہے تاکہ سامنے کی طرف موجود ہر چیز کو دیکھا جاسکے۔

یہ آنکھیں جسم کے نچلے حصے میں نہیں بنائی گئیں۔ اگر یہ آنکھیں ہاتھوں میں ہوتیں یا انہیں پیروں کے اندر لگا دیا جاتا (یا پھر سر کے اگلے حصے کے بجائے یہ سر کے عقبی حصے میں ہوتیں)۔

آنکھیں اگر ان مقامات پر ہوتیں تو آگے دیکھنے کے لئے انسان کو بار بار، اچھلنا پڑتا۔ ان مقامات پر آنکھیں ہوتیں تو بہت جلد خراب ہو جاتیں۔ انسان کے لئے یہ ممکن نہ ہوتا کہ وہ سامنے اور اطراف کے منظر کو دیکھ پاتا۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کی آنکھیں جسم کے سب سے بلند اور محفوظ مقام پر بنائیں اور انہیں ہڈیوں کے خول میں اس طرح رکھا جس طرح چراغ کو چراغ دان میں رکھا جاتا ہے۔“

نوٹ: آنکھیں جسم کے اسکینزر

امام جعفر صادق علیہ السلام نے اس زمانے کے لوگوں کی عقل و فہم کے پیش نظر آنکھوں کے بارے میں جو کچھ مختصر افرمایا، اسے میڈیکل سائنس اور فزیالوجی (علم فعلیات) کی تازہ ترین

معلومات کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔

آنکھ کا سائز تو آپ نے دیکھا ہی ہے۔ اس قدر مختصر سائز کے باوجود عقل کو ششدرا کر دینے والی انتہائی نازک ٹیکنالوجی کے ایک جگہ جمع ہو جانے میں جسم کا کوئی دوسرا عضو آنکھ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس مختصری جگہ میں اس قدر اعلیٰ ٹیکنالوجی استعمال کی گئی ہے کہ ہر آنکھ بیرونی دنیا سے بیک وقت 15 لاکھ پیغامات وصول کر کے انہیں دماغ میں موجود مرکز بصارت تک پہنچاتی رہتی ہے۔ آنکھیں دراصل دماغ کے لیے کسی (Scanner) کی طرح کام کرتی ہیں۔ ماں کے پیٹ سے نکلنے سے لے کر زمین کے پیٹ میں جانے تک انسان اس دنیا میں جو کچھ دیکھتا ہے، آنکھیں ان سب چیزوں، چہروں، شکلوں، نظاروں، عمارتوں، جانوروں، پہاڑوں، سمندروں، آسمانوں، سورج، چاند، ستاروں غرض ہر چیز کو اسکین کر کے انہیں بر قی کیمیائی سکنلز کی شکل میں دماغ کو ارسال کرتی رہتی ہیں۔ دماغ ان تفصیلات کو اپنی ”زبان“ میں منتقل کر کے ان کی الگ الگ فائلیں بنایا کر اپنے اندر محفوظ کرتا رہتا ہے۔ حیران کن بات یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی میں جو بھی معلومات حاصل کرتے ہیں، ان میں سے ۵۴ فیصد معلومات آنکھیں ہی ہمارے ارد گرد کی دنیا سے جمع کرتی ہیں۔

دیکھنے کے عمل کا آغاز

دیکھنے کے عمل کی ابتداء آنکھ کی پتلی (Pupil) سے ہوتی ہے۔ روشنی کی لہریں جب اس پتلی میں داخل ہوتی ہیں تو اس سے پہلے پتلی کے اوپر موجود قرنیہ (Cornea) کا نیم بیضوی کور (Cover) روشنی کی لہروں کو مخصوص زاویوں اور ایک خاص انداز سے موڑتا ہے اور تر چھا کر کے انہیں پتلی کے اندر داخل کرتا ہے۔

پتلی کے پیچے آنکھ کا عدسہ (Lens) موجود ہے۔ یہ عدسہ ایک سیال مادے سے بھرا رہتا ہے اور اس کے چاروں طرف ناقابلِ تصور حد تک نہیں پڑھے ہیں۔ جب یہ پڑھتے ہیں تو آپ قریب کی چیزوں کو واضح طور پر دیکھنے کے قابل ہو جاتے ہیں اور جب یہ پڑھتے پھیلتے ہیں تو

عظیم فضیلت جو صرف انسان کو عطا کی گئی ہے

آپ دور دراز کی اشیاء کو بہ آسانی دیکھ سکتے ہیں۔ اب آپ تصور کریں کہ قریب اور دور دیکھنے کا عمل آپ دن میں کتنی مرتبہ دہراتے ہیں۔ اگر قریب اور دور دیکھنے کی یہ مفت سہولت انسان کو دستیاب نہ ہو تو اس کی زندگی میں کس قدر دشواریاں پیدا ہو جائیں!

دونوں آنکھوں کے 26 کروڑ 14 لاکھ خلیے

آنکھ کا پرده (Retina) پیاز کے چھلکے کی طرح ہوتا ہے۔ اس کا سائز ایک اسکوا رائچ سے بھی کم ہے لیکن اس میں روشنی کے پیغامات کو وصول کرنے والے تیرہ کروڑ ستر لاکھ خلیے پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے 13 کروڑ خلیے سفید اور سیاہ رنگوں سے منعکس ہونے والی روشنی کے لئے مخصوص ہیں جب کہ 70 لاکھ خلیے تین بنیادی رنگوں اور ان کے امتزاج سے بننے والے لاکھوں کروڑوں رنگوں کو محسوس کرنے کی خدمات سرانجام دیتے ہیں۔ دونوں آنکھوں میں موجود خلیوں کی مجموعی تعداد 26 کروڑ 14 لاکھ بنتی ہے۔

برقی کیمیائی عمل

رات کے اندر ہیرے میں جیسے ہی کوئی جگنو چمکتا ہے تو آپ کی آنکھوں کے اندر ایک انہتائی پیچیدہ برقی کیمیائی عمل شروع ہو جاتا ہے۔ جگنو کی مدھم سی روشنی آنکھوں میں موجود 26 کروڑ خلیوں میں موجود سرخی مائل مادے کے رنگ کو ختم کر دیتی ہے۔ بلیچنگ (رنگ اٹانے) کے اس کیمیائی عمل کی وجہ سے ایک ہلکی سی (دولٹ کے کئی کروڑویں حصے کے برابر) برقی روپیدا ہوتی ہے۔ یہ برقی رو (یعنی کرنٹ) تین سو میل فی گھنٹا کی رفتار سے آنکھوں کے عقبی حصے اور دماغ کے درمیان موجود آپٹیک نر्व (Optic Nerve) میں داخل ہو جاتی ہے۔ دماغ اس برقی سکلن (یا برقی سکلنر) کوڑی کوڑ کر کے اپنا فیصلہ صادر کرتا ہے کہ نظر آنے والی شے ایک جگنو ہے۔ اس کے ساتھ ہی جگنو سے متعلق پہلے سے حاصل شدہ معلومات بھی آپ کو یاد آ جاتی ہیں۔

یہ تمام پیچیدہ برقی کیمیائی عمل ایک سینڈ کے اعشار یہ صفر صفر دو (0.002). ویس حصے میں مکمل ہو جاتا ہے۔

عظمیہ فضیلت جو صرف انسان کو عطا کی گئی ہے

کیا ماڈہ یہ مجرزے رونما کر سکتا ہے؟

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

”مفضل! ذرا غور تو کرو کہ کیا ایک بے شعور مادے میں یہ
صلاحیت ہو سکتی ہے کہ وہ انسانی خلقت میں اتنی مناسبوں کے
ساتھ اس قدر پیچیدہ اور حیران کن انتظامات کر سکے؟“

پانچ حواس اور ان کے کام

امام جعفر صادق علیہ السلام نے مفضل ابن عمرؓ سے گفتگو کرتے ہوئے انہیں جسم کے ان اعضاء کی جانب متوجہ فرمایا جن کی مدد سے ہمیں اپنے ارڈگرڈ کے ماحول، روشنی، تاریکی، گرمی، سردی، اشیاء، آوازوں اور خود اپنے ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ یہ اعضاء ہیں..... آنکھیں، کان، ناک، زبان اور ہماری جلد۔ انہی کی مدد سے ہم دیکھ سکتے ہیں، سن سکتے ہیں، سوٹھ سکتے ہیں، چکھ سکتے ہیں خود کو اور دوسری چیزوں کو محسوس کر سکتے ہیں۔ یہ پانچ اعضاء، پانچ حاس سے ہیں جو ہمیں پانچ حواس عطا کرتے ہیں۔

امام علیہ السلام نے فرمایا:

”دیکھو مفضل! آنکھیں اس لئے عطا کی گئیں کہ ہم ہر طرح کے رنگوں کو محسوس کر سکیں۔ اب دیکھو اگر آنکھیں ہوتیں لیکن رنگ نہ ہوتے، یا اس کے برعکس رنگ ہوتے اور آنکھیں نہ ہوتیں تو پھر پہلی صورت میں آنکھوں اور دوسری صورت میں رنگوں کا ہونا بے فائدہ ہوتا۔

اسی طرح کا نوں کا معاملہ ہے۔ کا نوں کو اللہ تعالیٰ نے سر کے دونوں جانب ایک خاص مناسبت کے ساتھ بنایا تاکہ یہ ہر طرف سے آنے والی آوازوں کو پوری طرح محسوس کر سکیں۔

اب اگر کان ہوتے اور آوازیں نہ ہوتیں، یا آوازیں ہوتیں اور پیکھر: 1 111

انہیں سننے والے کا نہ ہوتے تو آوازوں کا وجود بے فائدہ ہوتا
یا پہلی صورت میں کانوں کے ہونے کا کوئی مقصد نہ ہوتا۔ اسی
طرح دوسرے حاسوں (اعضاء) پر غور کرو۔“

نوٹ: کوئی چیز بے سبب نہیں ہوتی

مثلاً اگر دنیا میں ذائقے ہوتے اور ان سے لذت پہنچانے والی زبان نہ ہوتی تو دنیا کے سارے
ذائقے بے مقصد ہوتے۔ اگر قوت لامسہ (چھوکر محسوس کرنے والی قوت) نہ ہوتی تو گرمی، سردی،
زمی، سختی کے ہونے کا کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ اسی طرح اگر قوت لامسہ تو ہوتی لیکن گرمی، سردی، زمی، سختی
وغیرہ کا وجود نہ ہوتا تو قوت لامسہ کا وجود بیکار ہوتا۔ خوبصورتی میں اور ناک نہ ہوتی یا ناک تو ہوتی
مگر خوبصورتی میں نہ ہوتیں تو دونوں میں سے کوئی ایک چیز مثلاً ناک یا خوبصورت بے فائدہ ہوتی۔

حسوس اور محسوس ہونے والی چیزیں

امام علیہ السلام نے فرمایا:

”تو مفضل! ذرا غور تو کرو اس بات پر کہ خالق و مالک اللہ نے
کس طرح یہ مقدر کر دیا کہ ایک چیز دوسرے کو محسوس کرے اور ہر
حاسے (عضو) کے لئے (ارڈگرد کے ماحول سے) کسی ”محسوس“
کو مقرر کر دیا جو اس میں اپنا عمل کرے اور اس کے بارے میں
(تمہیں) بتائے۔“

نوٹ: حاسے ایک دوسرے سے قریب مگر

یعنی آنکھ کا کام صرف دکھانا ہے، کان سناتے ہیں، زبان چکھاتی ہے، ناک سنگھاتی ہے، جلد
محسوس کرتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہمارے یہ اعضاء ایک دوسرے سے چند سینٹی میٹر یا چند

انچ کے فاصلے پر ہوتے ہیں لیکن آنکھ کو نہیں معلوم کہ کان نے کیا سنا، کان کو نہیں معلوم ہوتا کہ آنکھ نے کیا دیکھا، زبان جو ذائقہ محسوس کرتی ہے اس کے بارے میں باقی حاسوں، کان، آنکھ، ناک یا جلد کو کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ اسی طرح زبان کے لئے بھی ممکن نہیں کہ وہ باقی حاسوں کی اطلاعات تک رسائی حاصل کر سکے! یہ ساری معلومات صرف اور صرف دماغ کو حاصل ہوتی ہیں۔

حاسوں اور محسوسات کے درمیان ایک واسطہ!

امام علیہ السلام نے اس کے بعد مفضل بن عمرؓ کو ایک اور حیران کن حقیقت کی طرف متوجہ فرمایا۔ یہ ایسی حقیقت تھی جس کے بارے میں جدید سائنسی دور کے سائنسدان بھی انیسویں صدی کے آخر تک کسی حصتی نتیجے تک پہنچنے میں ناکام رہے۔ (اس کی تفصیل سائنس کے طالب علم جانتے ہیں)

امام علیہ السلام نے فرمایا:

”دیکھو مفضل!“ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ حاسوں اور محسوسات کی جانے والی چیزوں کے درمیان اللہ تعالیٰ نے کچھ واسطے قرار دیے۔ جیسے روشنی اور ہوا..... اگر روشنی کا وجود نہ ہوتا تو آنکھیں کسی بھی رنگ کو محسوس نہیں کر سکتی تھیں اور اگر ہوانہ ہوتی جو آوازوں کو کانوں تک پہنچاتی ہے تو کان کسی بھی قسم کی آواز سننے سے قاصر رہتے۔“

(اسی طرح پانی کا معاملہ ہے۔ غذا کا ذائقہ زبان اسی وقت محسوس کر سکتی ہے جب وہ لعاب دہن کے ساتھ مل کر کسی قدر نیم سیال میں تبدیل ہو جائے۔ آس کریم کامزہ آپ کو اس وقت آتا ہے جب وہ منہ میں پکھل جاتی ہے)

نوث: حاسے اور ان کی صلاحیتیں میدی یکل سائنس کی روشنی میں

امام علیہ السلام نے آج سے کم و بیش ساڑھے بارہ سو سال پہلے جو کچھ فرمایا، وہ اس زمانے کے انسانوں کے علم اور ذہنی سطح کے مطابق بیان کیا اور اپنی بات کو مختصرًا بیان کیا۔ ہم امام علیہ السلام کے ارشادات کو جدید میدی یکل سائنس کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کا کسی قدر ادراک کر سکیں جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس دنیا میں زندہ رہنے کے لئے عطا کی ہے۔

آنکھوں کے بارے میں آپ گزشتہ باب میں پڑھ چکے ہیں۔ اس باب میں ہم کانوں کے بارے میں کسی قدر معلومات آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

کان..... ایک عظیم نعمت

کان ہمارا آکہ سماحت یا یوں کہہ لیں کہ یہ ایک ”ہنر نگ کمپیوٹر“ ہے۔ کان کو اگر آپ منی ایچ ائر لیشن کا شاہ کار کہیں تو غلط نہ ہوگا۔ کان کے اندر چھوٹی انگلی کے ناخن کے برابر جگہ میں اتنے الیکٹریکل سرکٹ موجود ہیں کہ اتنے سرکٹ کی مدد سے ایک اچھے خاصے بڑے شہر کو ٹیلی فون کی سہولت بہ آسانی فراہم کی جاسکتی ہے۔

بیرونی کان

کانوں کا بیرونی حصہ جسے ہم کان کہتے ہیں اس کا کام کسی ڈش انٹینا کی طرح ارڈگر موجود آوازوں کی لہروں کو جمع کر کے انہیں اندروں کان تک پہنچانا ہے۔ سننے کے جادوئی عمل کا آغاز اندروں کان سے ہوتا ہے۔

یہاں سے ایک لمبی اور چھوٹی سی نالی یا ٹیوب اندروں کان میں موجود ارڈر مرن تک جاتی ہے۔ ارڈر مرنی ہوئی باریک لیکن سخت جملی سے بنایا گیا ہے کسی ڈھول پر چڑھی ہوئی جھلی کی طرح۔ آواز کی لہریں اس جھلی سے اسی طرح ٹکراتی ہیں جیسے چھڑی کسی ڈھول سے ٹکراتی ہے۔

کان کے اس پر دے (اڑڈم) کی حساسیت کا اندازہ آپ اس طرح لگاسکتے ہیں کہ یہ حساس پر دہ ایک سینٹی میٹر کے ایک ارب ویں حصے کے برابر بھی متحرک ہو تو کان سے دماغ کے مخصوص حصے (مرکز سماعت) تک برقی کیمیائی عمل اور عمل کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور بالآخر ہوا کی وجہ نہیں کی لہر آپ کے لئے ایک با معنی لفظ یا ایک اہم اطلاع بن جاتی ہے۔

کان کی اندر ورنی بناوٹ

کان کا مرکز (Middle Ear) بمشکل لو بیا کے دانے کے برابر ہے۔ اس جگہ تین مختلف شکلوں کی ہڈیاں نصب ہیں۔ آواز کی لہروں کی وجہ سے کان کے پر دے میں جوارتعاش پیدا ہوتا ہے، ایک ہڈی اسے 22 گنا تیز کر کے اندر ورنی کان تک پہنچاتی ہے۔

اندر ورنی کان جو اصل آلہ سماعت ہے، ایک غار نما قلعے کی طرح ہے اور پانی جیسے سیال مادے سے بھرا رہتا ہے۔ اس کی شکل گونگھے جیسی ہے۔ اس کے دائروں اور گولاں میں گھومتی ہوئی اندر ورنی نالیاں نادیدہ بال نما اعصابی خلیوں سے بھری ہوتی ہیں۔

یہ خلیے اتنے چھوٹے ہیں کہ انہیں طاق تو خردہ بین کے بغیر دیکھنا ممکن نہیں ہے۔ حیران کن بات یہ ہے کہ ان میں سے ہر خلیہ آواز کی ایک علیحدہ لہر یا ارتعاش کو محسوس کرنے کے لئے مخصوص ہے اور صرف اس مخصوص ارتعاش ہی کو محسوس کر سکتا ہے۔

سننے کا عمل

جب انگریزی حرف ل ا کی شکل والی ہڈی آواز کی لہر کو اندر ورنی کان میں کھلنے والی بیضوی کھڑکی کے ذریعے اندر پہنچاتی ہے تو مرکز سماعت کی اندر ورنی نالیوں میں موجود سیال مادے میں ایک ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً کسی نے آپ کا نام پکارا: ”علی!“ تو سماعت مرکز کے لاکھوں کروڑوں بال جیسے خلیوں میں سے صرف ع.....لی کا ارتعاش محسوس کرنے والے خلیے ہی متحرک ہوں گے۔

ان خلیوں کی حرکت کی وجہ سے ایک بہت مدھم برقی رو پیدا ہوگی جو انتہائی برق رفتاری سے آڈیٹری نزو (Auditory Nerve) میں سرائیت کر جائے گی۔ یہ آڈیٹری نزو پنسل کے سکے جتنی

پتکی ہے اور اس میں 30 ہزار الیکٹریکل سرکٹ بیک وقت کام کرتے ہیں۔ آڈیٹری نرواس بر قی رو کو چند سینٹی میٹر کے فاصلے پر موجود دماغ کے مخصوص حصے تک پہنچائے گی۔ اس کے بعد دماغ فیصلہ کرے گا کہ یہ آواز کیا ہے یعنی کس چیز کی آواز ہے۔

آواز اور رُدِ عمل

اب آپ تصور فرمائیں کہ ہم بیک وقت کتنی آوازیں سنتے ہیں۔ دماغ آواز کی ان ہزاروں لاکھوں لہروں کے سگنلز الگ الگ کر کے، یکجا کرتا ہے اور ان آوازوں سے متعلق دماغ میں پہلے سے موجود بے شمار معلومات کو ہر آواز کے ساتھ الگ الگ منسلک کر کے آواز کی لہروں کو با معنی آوازوں اور اطلاعات میں تبدیل کر دیتا ہے تاکہ ہم اور آپ مشینوں کے شور، پنکھے یا اے۔ سی کی مدھم آوازوں، بارش کی بھوار، پرندوں کی چیکار، پتوں کی سرسر اہٹ، بادلوں کی گڑ گڑ اہٹ اور اپنے دوست یا عزیز کی آواز کو بیک وقت سن سکیں۔ انہیں الگ الگ پہچان سکیں اور ان آوازوں کی بنیاد پر اپنار عمل طے کر سکیں۔ مثلاً آپ اذان کی آوازن کر مسجد کی طرف قدم بڑھاتے ہیں اور فائرنگ کی آوازن کر کوئی محفوظ جگہ تلاش کرنے لگتے ہیں۔

جسم کا توازن کس طرح برقرار رہتا ہے؟

بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ ہمارے جسم کے توازن پر نظر رکھنا بھی کانوں ہی کی ذمہ داری ہے۔ جسم کے توازن کو برقرار رکھنے کا نظام ہمارے کانوں ہی کے اندر پایا جاتا ہے اور ایک ایک لمحے ہمارے توازن کو برقرار رکھنے میں مدد فراہم کرتا ہے۔

توازن کے نظام کے لئے اللہ تعالیٰ نے ہمارے کانوں میں نیم دائروں کی شکل کی تین نسخی منی نالیاں بنائی ہیں۔ انہیں یہی سرکلر کینال کہا جاتا ہے۔

یہ نالیاں ہر وقت ایک سیال مادے سے بھری رہتی ہیں۔ یہ نالیاں جسم کے اوپر نیچے، آگے پیچھے اور دائیں بائیں سمت کی طرف حرکات کو کنٹرول کرتی ہیں۔ جب آپ کبھی اچانک کسی چکنے فرش پر پھسلتے ہیں تو متعلقہ سمت والی نالی میں سے سیال مادہ غائب ہو جاتا ہے اور اس نالی میں

موجود خلیے اس کی اطلاع فوری طور پر دماغ کو دیتے ہیں۔

دماغ کا وہ حصہ جو ایسی ہنگامی حالت کو کنٹرول کرتا ہے، فوری ایکشن لیتا ہے۔ اگر کوئی شخص بائیں طرف گر رہا ہوتا ہے تو دماغ جسم کے دائیں سمت کے پھونکوں کو سخت ہو جانے کے احکامات جاری کرتا ہے اور اگر دائیں طرف گرنے کا امکان ہو تو دماغ بائیں سمت کے پھونکوں کو سخت ہو جانے اور جسم کو دائیں طرف کھینچنے کا حکم جاری کرتا ہے۔

اگر کسی شخص کے کاؤں کے اندر یہ نظامِ توازن کام کرنا بند کر دے تو اسے ہر وقت چکر آتے رہیں گے اور وہ کسی بھی قسم کی حرکت سے معدود ہو سکتا ہے۔

اگر کان نہ ہوتے

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا:

”مفضل۔ اب ذرا سوچو کہ اگر کسی شخص کے پاس کان جیسی نعمت موجود نہ ہو تو اس کی زندگی میں کس قدر خلل و خرابی پیدا ہو سکتی ہے۔ نہ وہ کسی کی گفتگوں سکتا ہے، نہ کسی سے گفتگو کر سکتا ہے۔ نہ اچھی بُری آوازوں کو سن سکے گا۔ اسے کسی بات میں مزہ ہی نہیں آئے گا اور وہ خود بھی اس حالت سے بیزار ہو جائے گا۔ دوسرے لوگ اس سے گفتگو کرنے میں سخت دشواری محسوس کریں گے۔ حتیٰ کہ اس سے چڑھ جائیں گے۔ آخر کار وہ ایک طرح کی شدید تنہائی کا شکار ہو جائے گا۔ وہ سب کے ساتھ انہی کی طرح زندہ ہو گا لیکن سارے ماحول اور معاشرے سے کٹا ہوا۔ جیسے زندوں کے درمیان مردہ۔“

دوبارہ غور کرو

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

”مفضل! ابتداء میں جو باتیں میں نے تمہیں حاسوں (آنکھ،
کان، زبان وغیرہ) کے بارے میں بتائیں میں اُن پر دوبارہ غور کرو کہ
حسوس کس طرح بنائے گئے، ان کے لئے اللہ تعالیٰ نے کون سے
اعضاء مقرر کیے۔ کس طرح اس حکیم خیر نے ان حاسوں کے لئے
کچھ چیزوں (مثلاً روشنی، ہوا، پانی) کو واسطہ قرار دیا۔ ان چیزوں کے
ذریعے ہمارے حاسے اور حواس کام کرتے ہیں۔“

(مثلاً روشنی کے بغیر آنکھیں، ہوا کے بغیر کان اور پانی کے بغیر زبان
مطلوبہ معلومات حاصل نہیں کر سکتی)

”تو مفضل! کیا ایک بے شعور مادے اور بے عقل طبیعت
(نیچر) میں یہ عالیشان قدرت و صلاحیت ہو سکتی ہے کہ وہ انسان
کے جسم میں اس قدر باریک و لطیف مناسبتیں پیدا کرے اور جسم
کے اس قدر حیران کن اعضاء بنائے اور ان اعضاء کو ایک دوسرے
کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ کرے۔ کوئی شخص جو عقل رکھتا ہو وہ
اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

تم سوچو کہ کیا یہ حیران کن انسانی جسم، اس کے اعضاء، ان
کی نشوونما، پھر ان اعضاء کی کارکردگی، ان اعضاء کے درمیان

یانجھ صواس اور ان کے کام

ہم آہنگی، ان کا باہمی ربط، بغیر کسی خالق اور صانع اور ایک عالم و
باخبر ذات یعنی اللہ رب العالمین کے علم وارادے اور ایک انتہائی
طے شدہ منصوبے کے بغیر پیدا ہو گیا؟“

.....

تمام مخلوقات کا ایک ہی خالق ہے

گزشتہ ابواب میں آپ نے ملاحظہ کیا کہ امام جعفر صادقؑ نے انسانی جسم، اس کے مختلف اعضاء، ان کی کارکردگی اور تمام اعضاء کے درمیان ایک دوسرے سے ہم آہنگی کو اثباتِ وجودِ خدا کے واضح دلائل کے طور پر بیان فرمایا۔ اعضاء کے درمیان ہم آہنگی پر غور کرنا ضروری ہے۔ اس بات کو ایک سرسری بات نہ سمجھیں۔ یہ ہم آہنگی، اعضاء کا ایک ٹیم کے طور پر کام کرنا، اللہ رب العالمین کی شان خلاقت کو بھی ظاہر کرتا اور اس کی وحدانیت کو بھی۔

مثلاً آنکھیں باہر موجود اشیاء کا عکس، الیکٹریکل سکنلز کی مدد سے دماغ کو روشنہ کرتی ہیں۔ دماغ اس سکنل کوڈی کوڈ کر کے فیصلہ صادر کرتا ہے کہ یہ کیا چیز ہے، اس کی ساخت، بناؤث، سائز، اس کے فائدے، نقصان کیا ہیں۔ اب مثلاً دماغ، آنکھ، روشنی یا اشیاء میں سے کوئی ایک بھی شے اگر کسی اور ”خالق“ کی بنائی ہوتی ہوئی تو آنکھ کے لئے ممکن نہیں تھا کہ وہ کسی بھی شے کو درست طور پر دیکھ سکے۔ دماغ کے لئے فیصلہ کرنا ممکن نہ ہوتا کہ یہ کیا شے ہے۔ اس طرح ہوتا تو ہمیں معلوم ہی نہ ہو پاتا کہ ہم سڑک دیکھ رہے ہیں یا کھیت، ہمیں جو شے دکھائی دے رہی ہے وہ گول ہے یا چوکور، یہ سودمند ہے یا نقصان دہ، یہ کھانے کی چیز ہے یا پینے کی۔

امام علیہ السلام نے فرمایا:

”مفضل! ذرا غور تو کرو، اس بات پر کہ یہ تمام اعضاء و جوارح اور عقل اور وہ تمام چیزیں جو انسانی وجود کے لئے ضروری ہیں، ان میں سے کوئی ایک بھی موجود نہ ہوتی تو انسان کی زندگی کس قدر تکلیف دہ ہو جاتی۔“

(مثلاً جسم کے تمام اعضاء اور عقل موجود ہوتی لیکن اس کے جسم کا نظامِ توازن کامنہ کرتا تو ایسے انسان کی مشکلات کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ بہت سے لوگ جو ایب نارمل ہوتے ہیں اس کی ایک مثال ہیں)

عقل کا فائدہ

امام علیہ السلام نے مفضل بن عمرؓ سے گفتگو کرتے ہوئے جسم کے مختلف اعضاء کے ساتھ انہیں عقل کی اہمیت کی جانب بھی متوجہ فرمایا اس لیے کہ تمام اعضاء کی موجودگی کے باوجود اگر انسان کے پاس عقل نہ ہو تو وہ شخص جانوروں کی طرح ہو گا بلکہ ان سے بدتر۔ کیونکہ وہ شخص بہت سی ایسی چیزوں کو بھی نہیں سمجھ سکتے گا جنہیں جانور سمجھتے اور جان سکتے ہیں (مثلاً غذا کی شناخت، اسے تلاش کرنا، اسی طرح دشمن کو پہچاننا اور خطرے سے بچنا)۔

امام علیہ السلام نے فرمایا:

”مفضل! تم نے دیکھا کہ عام انسان کے جسم میں اس کی ضرورت کی تمام چیزیں، اعضاء اور صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں، کوئی چیز کوئی صلاحیت مفقود یا غائب نہیں ہوتی۔ تو کیا یہ سب باتیں، انسانی خلقت میں یہ اہتمام، یہ باریکیاں اور نزاکتیں (یہ حیران کن نا درونا یاب آلات، اعضاء) کیا یہ چیزیں بے علم و ارادہ پیدا ہو گئیں؟“
(کیا ایک بے روح مادہ ان اعضاء کو خلق کر سکتا تھا)

نوث: عقلًا محال ہے

ایسا ہونا عقلًا محال ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ کے ڈرائیکٹ روم میں رکھی ہوئی شیشے کی میز اچانک ہی خود اپنے اندر آنکھیں، ہاتھ پیر، ناک کان، حلق اور معدہ پیدا کر لے اور صوفے پر بیٹھ کر نیچے بچھے ہوئے قالین کو کھانا شروع کر دے اور پھر بڑھنا شروع ہو جائے اور پھر ایک اور چھوٹی میز کو پیدا کرے اور یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہے۔

خارج از امکان بھی نہیں

اگرچہ عقلائی سب کچھ محال ہے مگر ایسا ہونا خارج از امکان بھی نہیں ہے لیکن اس عمل کے وقوع پذیر ہونے کے لئے اللہ تعالیٰ کے ارادے کی ضرورت ہوگی یا کسی ایسی ہستی کا ہونا ضروری ہوگا جسے اللہ تعالیٰ مجذہ رونما کرنے کی صلاحیت عطا فرمائے۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کا اژدها بن کر سانپوں کو نگلنا اور دوبارہ عصا میں تبدیل ہو جانا، اللہ کے رسولؐ کے ہاتھوں پر کنکریوں کا کلمہ پڑھنا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بلاں پر مردہ پرندوں کے اجزاء کا دوبارہ زندہ پرندوں میں تبدیل ہو جانا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ”قم باذن اللہ“ کہنے پر مردوں کا زندہ ہو جانا، حضرت امیر المؤمنینؑ کے ایک جملہ ادا کرنے سے انسان کا کتنے میں تبدیل ہو جانا اور پھر دوبارہ انسان بن جانا، حضرت امام علی نقیؑ کے ایک اشارے پر شیر قالین کا زندہ شیر میں تبدیل ہو کر ایک جادوگر کو نگل جانا..... یہ سب اللہ تعالیٰ کے علم، ارادے اور قدرت و طاقت کے نمونے ہیں اور ان سب افعال کے پیچھے ایک فاعل و قادر مطلق کی ذات موجود ہے۔

کئی افراد بعض اعضاء سے محروم کیوں؟

امام جعفر صادق علیہ السلام نے جسم کے اعضاء کے حوالے سے بات کی تو مفضل بن عمرؓ نے آپ سے سوال کیا۔ انہوں نے پوچھا: ”آقا! یہ فرمائیے کہ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے کہ بعض افراد بعض اعضاء و جوارح سے محروم ہوتے ہیں اور ان کی زندگی میں وہی مسائل پیدا ہوتے ہیں جن کی طرف آپ نے اشارہ فرمایا ہے؟“

امام جعفر صادق علیہ السلام نے جواب دیا۔

”یہ اس شخص کی تنبیہ (یا امتحان) کے لئے ہے جس میں یہ (نقص) پایا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایسا کچھ دوسروں (یعنی نارمل انسانوں) کی عبرت و نصیحت کے لئے (بھی) ہوتا ہے۔ جیسے

بادشاہ (حکمران یا حکومتیں) غلطیوں کی سزا میں مقرر کرتے ہیں اور ان سزاوں کو برا بھی نہیں سمجھا جاتا بلکہ ان سزاوں کی تعریف کی جاتی ہے۔ (انھیں دیکھ کر دوسرے لوگ عبرت پکڑتے ہیں)

اس کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جن لوگوں میں کوئی نقص جسمانی موجود ہو اور اس نقص کی وجہ سے ان کی زندگی سخت مشکلات کا شکار ہو جائے تو انہیں مرنے کے بعد اللہ رب کریم اس قدر ثواب عطا فرمائے گا کہ ان اعضاء کے نہ ہونے سے جو مصیبتیں دنیا میں ان پر پڑی تھیں، آخرت میں ان کے ثواب کو دیکھ کروہ انہیں انتہائی حقیر معلوم ہوں گی۔ یہاں تک کہ اگر انہیں مرنے کے بعد دوبارہ انھی آزمائشوں سے گزرنے کا اختیار دیا جائے تو وہ اس بات کو بہ خوشی قبول کریں گے تاکہ زیادہ سے زیادہ ثواب حاصل کر سکیں،۔

نوٹ: نیچر، خالق حقیقی کی محتاج ہے

اس موضوع پر اپنے چوتھے یکچھر میں امام جعفر صادق علیہ السلام نے تفصیل سے بات کی ہے۔ ہم اس یکچھر سے امام علیہ السلام کے چند کلمات یہاں درج کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔

امام علیہ السلام نے فرمایا:

”اب اگروہ کہیں کہ اشیائے عالم (یعنی جانداروں) میں ایسا کیوں ہوتا ہے، بعض جاندار ناقص اور بعض بالکل صحیح و سالم کیوں

پیدا ہوتے ہیں؟ تو ایسے لوگوں کو یہ جواب دیا جائے گا کہ یہ اس لیے تاکہ انسان سمجھ سکے کہ کسی شے یا جاندار کا پیدا ہونا طبیعت (یعنی نیچر) کے سبب نہیں ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ خالق حکیم کے ارادے اور اس کی تقدیر (پروگرام) کے مطابق ایسا ہوا ہے۔ اس نے طبیعت (نیچر) کو ایسا بنایا ہے کہ معمولاً تو ایک طے شدہ قاعدے اور قانون پر عمل کرے اور کبھی کبھی اس قانون سے ہٹ بھی جائے تاکہ انسانوں کی سمجھ میں آ سکے کہ یہ طبیعت (یعنی نیچر) بھی دراصل کسی اور ذات کے تصرف میں ہے اور کسی چیز کو وجود میں لانے کے لیے خالق حقیقی کی قدرت کی محتاج ہے۔“ اس کلام کی تشریح چوتھے یکھر میں پیش کی جائے گی۔

سر، ایک ہی کیوں پیدا کیا گیا؟

اب ہم امام علیہ السلام کے اس سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہیں۔

امام علیہ السلام نے فرمایا:

مفضل! اب ذرا غور کرو ان اعضاء میں جو ایک ایک یادو، دو پیدا کیے گئے اور اللہ تعالیٰ کی ان حکمتوں اور مصلحتوں پر توجہ مبذول کرو کہ اللہ نے کچھ اعضاء کو ایک، کچھ کو دو اور کچھ کو اس سے زیادہ پیدا کیا۔ آخر اس میں کیا فوائد ہیں؟

(مثلاً گردن، سر، دل، دماغ، زبان، معدہ، جگر، مثانہ ایک ایک پیدا کیے گئے۔ ہاتھ، پیر، کان، آنکھیں، گردے، اللہ نے دو دو عطا کیے، ہاتھوں

پیروں کی انگلیاں پانچ پانچ پیدا کیں، جبکہ دانتوں کی تعداد 32 ہے)

امام علیہ السلام نے فرمایا:

”مفضل! ذرا سرہی کو دیکھو۔ یہ ان اعضاء میں سے ہے جو ایک، ہی پیدا کیا گیا۔ کسی انسان کے لئے مناسب نہیں تھا کہ اس کی گردن پر ایک کی بجائے 2 سر ہوتے اس لئے کہ 2 سروں کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اگر انسان کی گردن پر 2 سر گاڈیے جاتے تو پھر یہ اضافی سر ایک بوجھ بن جاتا۔ جبکہ دوسرے سر کی ضرورت ہی نہیں تھی کیونکہ وہ تمام حاستے (محوس کرنے کے ذرائع) جن کی کسی انسان کو ضرورت ہوتی ہے وہ سب کے سب ایک، ہی سر میں موجود ہیں۔“

نوٹ: دماغ کے اندر اطلاعاتی مرکز

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ہم آنکھوں سے دیکھتے ہیں، کانوں سے سنتے ہیں، زبان سے چکھتے ہیں، ناک سے سوچتے ہیں، جلد کے ذریعے محسوس کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ آنکھوں، کانوں، زبان، ناک اور جلد کا کام بیرونی دنیا سے معلومات جمع کر کے انہیں بر قی کیمیائی سگنلز میں تبدیل کر کے دماغ تک پہنچانا ہے۔ ان معلومات کی بنیاد پر دماغ خود دیکھتا، سنتا، چکھتا، سوچتا اور محسوس کرتا ہے اور اس مقصد کے لئے دماغ کے اندر الگ الگ مرکز موجود ہیں جو اس سارے کام کو پروگرام کرتے یا سر انجام دیتے ہیں۔

اسی طرح ہاتھ پیروں یا جسم کے مختلف اعضاء کی حرکات بھی دماغ کے حکم کی پابند ہوتی ہیں اور اس مقصد کے لئے بھی دماغ میں الگ الگ مقام پر حرکات کو کنٹرول کرنے والے مرکز

موجود ہیں۔ یہ سب باتیں ماہرین حیاتیات نے انھاروں اور انیسوں صدی عیسویں میں معلوم کیں جب کہ امام نے جسم و دماغ کے بارے میں یہ حیران کن اکتشافات ساتویں صدی عیسوی کے دوران فرمائے کہ انسان کو جن حاسوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ سر (یعنی دماغ) کے اندر موجود ہوتے ہیں۔

اگر 2 سر ہوتے؟

امام علیہ السلام نے فرمایا:

”اگر انسان کے ایک کی بجائے 2 سر ہوتے تو ایک آدمی کے دو حصے ہو جاتے (یعنی وہ دو شخصیتوں میں بٹ جاتا)۔

2 سروں (یعنی دو دماغوں) کی موجودگی میں اگر وہ ایک سر (دماغ) سے گفتگو کرتا (یا عمل اور رد عمل کا اظہار کرتا) تو دوسرا فال تو سمجھا جاتا۔ اور اگر وہ دونوں سروں (یعنی دماغوں) سے کام لیتا تو یہ ایک فضولی بات ہوتی اور اگر وہ ایک سر (یعنی دماغ) سے ایک بات کرتا اور دوسرے سے دوسری بات کرتا تو سننے والا سمجھنہ پاتا کہ کون سی بات صحیح ہے اور کون سی غلط۔ کس بات پر اعتبار کیا جائے اور کسے نظر انداز کر دیا جائے؟“۔

(پھر یہ بھی ہوتا کہ ایک دماغ جسم کو کچھ حکم دیتا اور دوسرا دماغ اس کے برعکس حکم دیتا تو انسانی اعضاء و جوارح، رُگیں اور پٹھے آخر کار مفلوج ہو کر رہ جاتے۔)

ہاتھ دو کیوں بنائے گئے؟

ہاتھوں کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے انسان کو صنعت و حرفت اور کھیتی باڑی کرنے، اپنے خیالات

کو قلم بند کرنے، اپنے تصورات کو مختلف صورتوں میں عملی شکل دینے کی صلاحیت عطا کی ہے۔ اسی لئے ہاتھوں کے بارے میں امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

”مفضل! دیکھو، اگر انسان کو کام کرنے کے لئے صرف ایک ہاتھ دیا جاتا تو ہرگز مناسب نہ ہوتا۔ اس سے انسان کے ان کاموں میں خلل پیدا ہوتا جنہیں وہ دو ہاتھوں سے سرانجام دیتا ہے اور جن کاموں کا کرنا ناگزیر ہے۔ مثلاً اگر کسی بڑھی کا ایک ہاتھ مفلوج ہو جائے تو کس طرح اپنا کام سرانجام دے سکتا ہے۔“

حنجرہ Larynx کیوں پیدا کیا گیا؟

اردو لغت کے مطابق لفظ حنجرہ کا ترجمہ زخرہ، حلق اور ٹیٹو اکیا گیا ہے لیکن علم فعالیات (فزیالوجی) کے مطابق حنجرہ (Larynx) حلق میں موجود اس نالی کو کہا جاتا ہے جو بولتے اور نگلتے وقت ہوا اور غذا کے نوا لے یا پانی کے گھونٹ کو انتہائی نفاست کے ساتھ درست سمت میں روانہ کرتی ہے یعنی غذا یا پانی کو معدے کی نالی (Esophagus) کی طرف اور ہوا کو سانس کی نالی (Trachea) کی جانب۔

امام علیہ السلام نے فرمایا:

حنجرہ (Larynx) اس لئے بنایا گیا تاکہ اس کے ذریعے لطیف ہوا (یعنی گرد و غبار اور جراثیم سے پاک تازہ اور مرطوب ہوا) پھیپھیوں تک پہنچ سکے اور دل کو متواتر اور پے در پے آنے والی سانس سے آرام دے۔

آواز اور اس کے آلات

امام علیہ السلام نے فرمایا:

”مفضل! ذرا انسان کی آواز، اس کی گفتگو، حروف و الفاظ اور جملوں کے منہ سے نکلنے اور اس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو آلات دیے ہیں ان پر غور کرو۔ دیکھو حنجرہ (Larynx) تو ایک نلکی (یانا لی) جیسا ہے جس سے آواز نکلتی ہے۔ زبان، دانت، ہونٹ اور (ناک) ہوا کو حروف و الفاظ میں ڈھانے کا سانچا ہیں۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جس شخص کے دانت گر جاتے ہیں تو وہ حرف ”س“، ادا نہیں کر پاتا اور جس کے ہونٹ کٹ جائیں تو وہ حرف ”ف“، ادا نہیں کر سکتا اور جس کی زبان مولیٰ ہوا س کے لئے حرف ”ر“، کو ادا کرنا مشکل ہوتا ہے۔

تو دیکھو! کہ حنجرہ تو بانسری سے مشابہ ہے اور پھیپھڑے لوہار کی دھونکنی جیسے ہیں اور پھیپھڑوں کو دبانے (کنٹرول کرنے) والے پٹھے بین بجانے والے کی انگلیوں کی طرح ہیں۔

دھونکنی یعنی پھیپھڑے پچکتے ہیں تو ان سے ہوا باہر نکلتی ہے۔ پھر زبان، ہونٹ اور دانت (اور ناک) اس ہوا کو حروف و الفاظ یا راگ کی شکل دیتے ہیں۔ یہ ان انگلیوں کی طرح ہیں جو بانسری کے مختلف سوراخوں کو ایک خاص ترتیب سے کھولتی

اور بند کرتی رہتی ہیں۔“

امام علیہ السلام نے آج سے کم و بیش ساڑھے تیرہ سو سال پہلے مشابہات کے ذریعے بولنے کے حیران کن عمل کے بارے میں جو کچھ فرمایا اس کی تشریح انشاء اللہ الگلے باب میں جدید میڈیکل سائنس اور فزیالوجی کی مدد سے بیان کریں گے تاکہ قارئین سمجھ سکیں کہ امام نے مثالوں کے ذریعے جو بات سمجھائی ہے وہ ایک حیران کن سائنسی حقیقت ہے۔ اس حوالے سے امام کے دور سے صدیوں پہلے اور صدیوں بعد بھی اس کرۂ ارض پر عام انسان کو کچھ معلوم نہیں تھا۔

بَاب: 12

امام جعفر صادق علیہ السلام کا دور..... اور جدید سائنسی زمانہ

یورپ کے سائنسدانوں نے انسانی جسم کی ساخت اور کارکردگی کے بارے میں معلومات پندرہویں اور سولہویں صدی عیسوی میں حاصل کرنا شروع کیں۔ اس زمانے میں یورپ کے میڈیکل کالجز میں عربی زبان میں تعلیم دی جاتی تھی اور تعلیمی اداروں میں ان مسلمان فلاسفہ کی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں جو امام جعفر صادق علیہ السلام کے کئی صدی بعد پیدا ہوئے تھے۔

ائلی کے نامور مصور اور سائنسدان لیونارڈو ڈاؤنسی (Leonardo Davinci) اور پیلچیر ڈیم کے نامور ڈاکٹر اندر لیس ویسا لیس (Andreas Vesalius) نے 15 ویں اور 16 ویں صدی عیسوی کے زمانے میں اپنے تجربات کے دوران سینکڑوں لاشوں کے پوسٹ مارٹم کیے اور اعضاء کی کارکردگی و ساخت کو جاننے کے ساتھ ساتھ ان کی تصاویر بھی بنائیں۔ 1543 عیسوی میں ڈاکٹر اندر لیس ویسا لیس نے ایناٹومی پر پہلی کتاب لکھی جس کا نام تھا ”دی اسٹر کچر آف دی ہیون باؤڈی“۔ جسم انسانی کے اعضاء اور ان اعضاء کے درمیان باہمی ربط اور کارکردگی کا تفصیلی معائنہ آتشی شیشے، سادہ خرد بین اور پھر 1930ء میں الکیٹران خرد بین کی ایجاد کے بعد ہی ممکن ہوا کہ

اس باب میں آپ امام علیہ السلام کے ان ارشادات کی سائنسی تشریح ملاحظہ کریں گے جنہیں آپ نے گزشتہ باب میں پڑھنے کی سعادت حاصل کی ہے۔

نوٹ: انسان، آواز اور گفتگو کے آلات

بولنا یا گفتگو کرنا ہمارے لیے ایک عام سی بات ہے لیکن ہم تصور ہی نہیں کر سکتے کہ بولنے اور سننے کے عمل میں ہمارے جسم کے کتنے خلیے، اعضاء، صلاحتیں کام کرتی ہیں اور کس قدر تو انہی خرچ

ہوتی ہے اور یہ تو انائی کہاں سے آتی ہے؟

ذراغور فرمائیں کہ پھونک مارنے اور سانس خارج کرنے میں بھی ہوا پھیپھڑوں سے نکلتی ہے اور منہ یا ناک سے خارج ہوتی ہے لیکن یہی ہوا جب ہمارے ارادے کے تابع ہوتی ہے تو با معنی لفظ، با مقصد جملہ، متاثر کن تقریر یا ایک نشاط انگیزگیت کس طرح بن جاتی ہے؟

امام علیہ السلام نے اپنے زمانے کی مجبوریوں (یعنی علم انسانی کی کم مایگی) کے سبب اپنی بات سمجھانے کے لیے متشابہات کے سہارے بولنے کے حیران کن عمل کو ہمارے لیے بیان فرمایا۔ آئیے اب ہم امام علیہ السلام کے اس کلام کو فزیالوجی اور ایناٹومی کی مدد سے بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ ہمارے قارئین اللہ تعالیٰ کی شانِ خالقیت اور اس کے انعام و اکرام اور علم امامت کا کسی قدر اندازہ کر سکیں۔

حلق..... ایک عظیم نعمت

آپ صبح اٹھ کر اپنے والدین کو السلام علیکم یا اپنے بچوں کو ”علیکم السلام“ کہتے ہیں تو آپ اندازہ ہی نہیں کر سکتے کہ ان لفظوں کی ادا میگی میں جسم کے کتنے کھرب خلیے، غددوں، اعضاء، رگیں اور پٹھے حصہ لیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان الفاظ کی ادا میگی کے دوران جسم کے اندر کس قدر الیکٹریکل، مکینیکل اور برقی کیمیائی سرگرمیاں رونما ہوتی ہیں جن کے ذریعے آپ اس قابل ہوتے ہیں کہ پھیپھڑوں میں موجود ہوا، ایک انتہائی پراسرار و پیچیدہ عمل سے گزر کر با معنی الفاظ کی شکل اختیار کر سکے۔

بولنے یا گفتگو کرنے کے یہ حیران کن معجزے ہمارے حلق کے اندر رونما ہوتے ہیں۔ حلق ہمارے پیدا کرنے والے کا انوکھا اور عقل کو ششدرا کر دینے والا ایک عظیم شاہکار، ایک بیش بہا نعمت ہے۔ عام لوگ حلق کو ایک پائپ کا ٹکڑا سمجھتے ہیں جس کے ذریعے کھانا، پانی ان کے پیٹ میں جاتا ہے، لیکن بات اتنی سادہ نہیں ہے۔

حلق کے اندر ذرائع نقل و حمل کا ایک بہت عظیم الشان نظام کام کرتا ہے جو واضح طور پر کھلنے اور بند ہونے والے سکڑ نے اور پھلنے والے، ایسے آلات سے مکمل طور پر لیس ہے جو ہر قسم کی

ٹنول غذا، لاکھوں کیوبک فٹ ہوا، منوں پانی، ٹھوس، سیال، سخت، نرم اور گرم چیزوں کو انہائی ذمے داری، نفاست اور حفاظت کے ساتھ آپ کے معدے یا پھیپھڑوں تک پہنچانے کی اعلیٰ ترین صلاحیتوں کے حامل ہیں۔

حلق کے اندر موجود قدرت کی اعلیٰ ترین انجینئرنگ کے یہ نادر و نایاب آلات و اعضاء نہ ہوتے تو غذا کا کوئی نوالہ، پانی کا کوئی گھونٹ اور زندہ رہنے کے لیے ایک سانس بھی جسم کے اندر نہ پہنچ پاتی۔ حلق کے ان آلات کی کارکردگی میں معمولی سی بھول چوک یا ذرا سی غلطی بھی اکثر جان لیوا ثابت ہوتی ہے۔

ہم اور آپ زندگی میں کروڑوں نوالے نگتے ہیں، کھربوں گھونٹ پانی کے پیتے ہیں اور بے شمار مرتبہ سانس لیتے، نکلتے اور اربوں کھربوں لفظ بولتے ہیں لیکن ہمارے حلق کے یہ نادر و نایاب آلات ہر مرتبہ یہ کام انہائی نفاست اور پنپے تلے انداز میں سرانجام دیتے ہیں۔

ماہرین کہتے ہیں کہ ہر بار نوالہ نگتے اور پانی پیتے وقت اس نظام کی کارکردگی ہی یہ طے کرتی ہے کہ انسان کو مزید زندہ رہنا ہے یا اس نوالے یا پانی کے اس گھونٹ کو استعمال کرنے کی کوشش میں اسے زندگی سے ہاتھ دھولینا ہیں۔ (حوالہ: جسم کے عجائب)

حلق کی حیران کن بناؤٹ

آئیے دیکھتے ہیں کہ حلق ہے کیا؟

آپ کی گردن کا مختصر سا علاقہ بے شمار اعصاب، خون کی نالیوں، ریڑھ کی ہڈی کے مہروں، دوسرے کئی آلات و تنصیبات اور خود حلق کی نالیوں کی وجہ سے زبردست "ٹریفک جام" کا منظر پیش کرتا ہے۔

حلق کی پہلی نالی فیرینکس (Pharynx) ہے۔ اس کی شکل کسی قیف سے ملتی جلتی ہے یعنی اوپ سے چوڑی اور نیچے بتدریج تلی ہوتی ہوئی۔ یہ پانچ انج لمبی ہے اور آپ کی ناک کے پیچھے سے شروع ہو کر آپ کے نزرے کی ہڈی تک آتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی حلق کی دوسری نالی ہے۔ اسے لیرینکس (Larynx) کہا جاتا ہے۔ اردو میں اسے حنجرہ کہتے ہیں۔ یہ نالی بے حد

اہم جگہ واقع ہے۔ بولنے اور کھانے کی صورت میں ہوا اور غذا کو یہی نالی درست سمت میں روانہ کرتی ہے۔ یعنی غذا کو معدے کی طرف اور ہوا کو پھیپھڑوں کی جانب۔

یہی وہ نادر و نایاب آلہ ہے جو بولنے کے نظام میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس کی شکل کرکٹ کے بیٹ جیسی ہے۔ یہ نالی نو عدد گول اور زم ہڈیوں کا مجموعہ ہے اور پونے دو انچ کے قریب لمبی ہے۔ گول دائروں کی شکل والی یہ زم ہڈیاں رطوبت جیسی جھلی میں پیک ہوتی ہیں اور پٹی کی مضبوط جھلی (Lagaments) کے ذریعے ایک دوسرے سے جڑی رہتی ہیں۔

لیرینکس کے نیچے دو مزید نالیاں ہیں۔ ایسو فیگس (Esophagus) نامی نالی سیدھی معدے میں جاتی ہے۔ یہ غذا کی گز رگاہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی سانس کی نالی ہے۔ اسے ٹریچا (Trachea) کہا جاتا ہے۔ یہ نالی پھیپھڑوں میں جا کر کھلتی ہے۔ یہ دونوں تقریباً ایک انچ قطر کی ہوتی ہیں۔

آواز وال الفاظ کس طرح پیدا ہوتے ہیں

بولنے یا پھیپھڑوں سے نکلنے والی ہوا کو با معنی الفاظ میں تبدیل کرنے والے آلات بھی حلق ہی میں پائے جاتے ہیں انہیں ووکل کورڈز (Vocal Cords) کہا جاتا ہے۔ پھیپھڑوں سے نکلنے والی ہوا، ان کے ذریعے حلق ہی سے آواز میں تبدیل ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ یہ ووکل کورڈز ہمارے ہونٹوں جیسے ہوتے ہیں۔ سفیدی مائل اور چمک دار۔ ان ووکل کورڈز کو پٹھوں کا ایک انتہائی پیچیدہ نظام کنشروں کرتا ہے۔

جب یہ کھلتے ہیں تو آپ کے حلق سے مدہم اور گہری آواز نکلتی ہے۔ جب یہ سکڑتے ہیں تو آپ کی آواز پتلی اور نجی اور تیز ہو جاتی ہے۔ اور جب آپ کچھ نگل رہے ہوتے ہیں تو ووکل کورڈز بالکل بند ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے نگلتے وقت کچھ بولنا ممکن نہیں ہوتا۔ حلق کے نظام سے کبھی کوئی لمح بھر کی بھول چوک ہو جائے تو بات دوسری ہے۔ آواز تو اس وقت بھی نہیں نکلتی لیکن جان نکل جانے کا امکان ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔ واضح رہے کہ اسلامی احکامات کے مطابق کھانا کھانے کے

دوران گفتگو کرنے کو منع کیا گیا ہے۔

حلق میں موجود یہ وکل کورڈز سائنس کی نالی سے ہوئوں تک سات انج کے علاقے میں موجود ہوتے ہیں اور کسی پائپ نما باجے (بین یا بانسری) کی طرح کام کرتے ہیں۔ جب آپ بولنے کا ارادہ کرتے ہیں تو پھیپھڑوں کو کنٹرول کرنے والے پٹھے پھیپھڑوں کو دباتے ہیں۔ پھیپھڑوں سے نکلنے والی ہوا حلق کی جانب آتی ہے اور وکل کورڈز سے گزر کر منہ میں داخل ہوتی ہے۔ اس مرحلے پر یہ نامکمل اور ناقص آواز ہوتی ہے۔ منہ کے اندر آنے کے بعد زبان، ہونٹ، تالو اور ناک اس خام یا ناقص آواز کو مکمل اور بامعنی آواز والفاظ میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

حیران کن بات یہ ہے کہ یہ سارے الیکٹریکل، مکینکل اور بر قی کیمیائی کام سینٹروں میں مکمل ہو جاتے ہیں۔ آپ تصور فرمائیں کہ آپ دن میں کتنی بار بولتے ہیں یا مقرر یں کس رفتار سے ہوا کو بامعنی الفاظ میں تبدیل کر رہے ہوتے ہیں، بغیر کسی تکلیف، بغیر کسی مشقت اور بغیر کسی معاوضے کی ادائیگی کے۔

(اقتباس: I am Geo's Body)

(امام علیہ السلام کی جانب سے اس سوال کی سرسری سی تشرح آپ نے ملاحظہ کی جو امام جعفر صادق علیہ السلام نے مفضل ابن عمرؓ سے پوچھا کہ حجرہ (حلق، نخرہ یا لیرینکس) کیوں پیدا کیا گیا؟ پھر امامؓ نے خود ہی اس سوال کا جواب اس زمانے کے لوگوں کی ذہنی سطح اور معلومات کے پیش نظر مختصر اور مثالوں کے ساتھ بیان فرمایا۔ بہتر ہو گا کہ آپ گزشتہ باب کے آخری حصے کا دوبارہ مطالعہ فرمائیں)

زبان کے فائدے

اس کے بعد امام جعفر صادق علیہ السلام نے مفضل ابن عمرؓ کو گرا عضائے جسمانی اور ان کی ضرورت و مصلحت کی جانب متوجہ فرمایا:

مفضل! دیکھو! زبان اس لیے پیدا کی گئی کہ وہ کھانوں کا

ذائقہ معلوم کر سکے۔ ہر ذائقے کو الگ الگ محسوس کر سکے۔ میٹھے کو کھٹے سے اور نمکین کوشیریں سے الگ پہچان سکے۔ زبان کا ایک یہ بھی فائدہ ہے کہ اس سے کھانا پینا خوشگوار معلوم ہونے میں مدد ملتی ہے۔

نوت: زبان کیا ہے؟

زبان دراصل ایک خاص طرح کی کھال ہے جو پروٹین ہی سے بنی ہے۔ یعنی یہ گوشت ہی کا ایک ٹکڑا ہے۔ جس طرح کی کھال سے یہ بنی ہے اسے میوسکس ممبرین کہا جاتا ہے۔ میوسکس ممبرین، کھال یا جلد کی وہ قسم ہے جو منہ، زبان، ناک اور غذا کی اندر ورنی نالیوں پر پائی جاتی ہے۔ زبان ظاہراً گوشت کا ٹکڑا ہے لیکن اس کے اندر پھوٹوں اور نازک اعصاب کا ایک انتہائی پیچیدہ نظام کام کرتا ہے۔ زبان کو آپ ہاتھ لگا کر دیکھیں تو اس کی سطح آپ کو کھردی محسوس ہوگی۔ یہ ایک خاص انداز سے نرم اور کھردی ہے اور اسی وجہ سے یہ غذا کو آسانی کے ساتھ اٹھا کر حلق تک پہنچاتی ہے۔

ذائقوں کو محسوس کرنے والے ابھار (Taste Buds) بھی اسی کھردی سطح پر پائے جاتے ہیں۔ ان ابھاروں میں وہ خلیے ہوتے ہیں جو غذا کے ذائقے کو محسوس کر کے ذائقے کی تفصیلات دماغ کے مخصوص حصے تک پہنچاتے ہیں۔

یہ ابھار بے شمار، لاتعداد ذائقوں کو دراصل ایک کیمیائی عمل کے ذریعے شناخت کرتے ہیں۔ یہ ابھار زبان کی سطح ہی پر نہیں، اس کے نچلے حصے اور تالو میں بھی پائے جاتے ہیں۔ ماہرین حیاتیات کا خیال ہے کہ زبان اور تالو کے مختلف حصے کڑوے، میٹھے، نمکین اور کھٹے، جیسے چار بنیادی ذائقوں کی شناخت کرتے ہیں۔ ہمارے کھانوں میں ان بنیادی ذائقوں کے امتزاج سے سینکڑوں ہزاروں ذائقے بنتے ہیں۔ (ان چار ذائقوں کے بارے میں امام کا کلام آپ پڑھ چکے ہیں)۔

منہ اور زبان میں موجود ذائقہ محسوس کرنے والے ابھاران چار بنیادی ذائقوں اور ان کے امترزاج سے بننے والے ہر ذائقے کے بارے میں تفصیلات دماغ کو روanonہ کرتے ہیں اور دماغ یہ فصلہ کرتا ہے کہ ذائقہ کیسا ہے۔

غذا میں جب دانتوں اور داڑھوں کے ذریعے پسے اور لعاب دہن کے ساتھ مل کر قیق شکل اختیار کرتی ہیں تو ان کے مختلف اجزاء زبان، تالا و اور منہ کے دوسرے مقامات پر موجود مختلف حساس ابھاروں کو متحرک کر دیتے ہیں۔ ان مخصوص حساس ابھاروں سے ایک بہت مدھم برقی روپیدا ہوتی ہے اور بے حد حساس اعصاب سے گزر کر دماغ کے مخصوص حصے میں سراہیت کرتی رہتی ہے۔ دماغ کا یہ حصہ ان برقی سگنلز کوڈی کوڈ کرتا جاتا ہے اور آپ کو معلوم ہوتا رہتا ہے کہ غذا کا ذائقہ کیسا ہے۔ ذائقہ محسوس کرنے کی یہ صلاحیت ہی ہے جس کی وجہ سے انسان غذا استعمال کرتا ہے۔ اگر غذا استعمال کرنے اور پانی پینے میں ہمیں لذت و ذائقہ محسوس نہ ہو تو ہمارے لیے کھانا پینا ایک عذاب بن کر رہ جائے۔

زبان کی ایک بیماری جسے ڈاکٹرز Dysgeusia کہتے ہیں، اس میں زبان کا مزہ خراب ہو جاتا ہے؛ مٹھاس بری لگنے لگتی ہے۔ گوشت دیکھنے کو دل نہیں کرتا۔ ٹافی نمکین محسوس ہوتی ہے۔ زبان کی اور ایک بیماری Hypogeusia کہلاتی ہے۔ اس بیماری میں چکن روست نزم رہڑ کی طرح محسوس ہوتا ہے اور اسے منہ میں لینے سے ابکائی آنے لگتی ہے۔ مٹھاس کم محسوس ہوتی ہے۔ اس بیماری کی انتہائی شکل میں ذائقہ اور کھانے پینے کے مزے مکمل طور پر ختم ہو جاتے ہیں اور انسان شدید مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے۔ (اقتباس: جسم کے عجائب)

یہ ہے زبان اور ذائقوں کی کسی قدر تفصیل جس کے بارے میں امام علیہ السلام نے مفضل ابن عمر کو مختصر الفاظ میں آگاہ فرمایا تھا۔

باب: 13

دانٹ، ہونٹ اور آنکھیں

گزشتہ باب میں ہم نے امام علیہ السلام کے ان ارشادات کی کسی قدر تشریع پیش کی تھی جن میں امام علیہ السلام نے زبان اور بولنے کے آلات مثلاً حلق، منہ اور زبان وغیرہ کے بارے میں بتایا تھا۔ زیرِ نظر باب میں ہم دانتوں، ہونٹ اور آنکھوں کے بارے میں امام علیہ السلام کی مزید گفتگو پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔

دانٹوں کے فائدے

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

”مفضل دیکھو! دانت (اور داڑھیں) غذا کو چباتے ہیں تاکہ وہ نرم ہو جائے اور اس کا ہضم ہونا آسان ہو جائے۔ اس کے علاوہ دانت اس لئے بھی پیدا کیے گئے کہ وہ ہونٹوں کو سہارا دیں کہ وہ اندر کی طرف نہ چلے جائیں۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ جن لوگوں کے دانت گر جائیں تو ان کے ہونٹ ڈھیلے ہو کر اندر کو چلے جاتے ہیں۔“ (مطلوب یہ کہ دانت اور ہونٹ مل کر چہرے کو ایک خاص طرح کا حسن اور تناسب عطا کرتے ہیں۔)

منہ کے دروازے

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

”ہونٹوں کے بہت سے فائدے ہیں۔ ہونٹوں کی مدد سے

انسان پانی کو گھونٹ گھونٹ کر کے پی سکتا ہے۔ پانی کو کچھ دیر کے لئے منہ میں رکھ سکتا ہے۔ اگر ہونٹ نہ ہوتے تو پانی کو براہ راست منہ میں ڈالنا پڑتا۔ اس طرح پانی حلق کے اندر بغیر کسی اندازے کے جاتا اور اس سے گلے میں پھنسنا لگنے کا خطرہ موجود ہتا۔

پھر یہ ہونٹ منہ کے لئے ایک دروازے کی طرح (بھی) ہیں کہ انسان جب چاہے اس دروازے کو کھولے اور جب چاہے بند کر لے۔ اگر ہونٹ نہ ہوتے اور صرف دانت ہوتے تو انسانی چہرہ کس قدر بدنما دکھائی دیتا؟“

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

”وَيَكُوْنُ مُفْضِلًا! مِنْ نَّمَّ مِنْ تَمَّ سَمَّ جَنِّ اعْضَاءِ كَافِرَ كَرْ كِيَا، اَنْ مِنْ هُرَأَيْكَ كَيْئَيْ فَآمَدَهُ مِنْ اَوْرَيْ كَيْئَيْ كَيْئَيْ كَامُوْنَ مِنْ اَنْسَانَ كَوْ مَدْ فَرَاهَمَ كَرْتَهُ مِنْ هُنْ۔ جِسْ مِنْ هُنْ ہَتْهُوْرِي، جِسْ مِنْ هُنْ کِيلْ بَجْهِي ٹُھُونْکِي جَاسْكَتِي ہَے اُور لُوْہَے کو کوئی شَكْلِ بَجْهِي دِي جَاسْكَتِي ہَے۔“

(مثلاً ناک سو نگھنے کا کام بھی کرتی اور سائزوں کو جراشیم سے صاف کرنے اور اسے پھیپھڑوں کے لیے قابل استعمال بنانے کا کام بھی۔ اسی طرح زبان ذائقوں سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ بولنے اور غذا کو حلق تک پہنچانے کا فریضہ بھی سرانجام دیتی ہے)۔

نوٹ: منہ اور جراشیم

ہونٹوں کی وجہ سے انسان اپنا منہ کھول یا بند کر سکتا ہے۔ اگر منہ کھلا ہی رہا کرتا تو گرد و غبار، حشرات مثلاً چیونٹیاں، مچھر اور دوسرے کیڑے مکوڑے منہ گھس جایا کرتے۔ اسی طرح فضا میں

موجود بے شما، جراشیم اور دھوئیں کے ذرات منہ میں اپنی جگہ بنائیتے۔

یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ ناک اور کانوں کے سوراخ بھی تو کھلے ہوئے ہیں۔ ان میں ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ کیڑے مکوڑے یا جراشیم وہاں گھس جائیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ کانوں اور ناک کے اندر اللہ نے بہت سے دوسرے حفاظتی انتظامات کیے ہیں مثلاً ناک کے نظر آنے والے (ماگرو اسکو پک) بال اور ایک چپ چپی رطوبت، یہ سب مل کر گرد و غبار اور جراشیم کو سانس کی نالی تک پہنچنے سے پہلے ہی پکڑ کر ہلاک کر دیتے ہیں۔

اسی طرح کانوں کا معاملہ ہے۔ کانوں کی بناوٹ اندر سے بھول بھیلوں کی طرح ہے اور وہاں بھی ایک زہریلی رطوبت موجود رہتی ہے جس کے سبب حشرات یا جراشیم اندر ورنی کان تک نہیں پہنچ پاتے۔ آنکھیں بھی کھلی رہتی ہیں۔ ان کے حفاظتی اقدامات کے بارے میں آپ آگے پڑھیں گے۔

آنکھوں کے پوٹے اور پلکیں

”مفضل! ذرا آنکھوں کے پوٹوں پر غور کرو کہ یہ کس طرح آنکھ کے پردے یا غلاف کی طرح بنائے گئے اور آنکھوں کی پلکیں ان ڈوریوں کی طرح ہیں جنہیں پکڑ کر پردوں کو اٹھایا اور چھوڑا جاتا ہے۔ آنکھ کو (جو ایک انتہائی نازک عضو ہے) اللہ تعالیٰ نے کس طرح چہرے پر موجود گڑھوں میں رکھا اور پھر انہیں پوٹوں کے ذریعے (ایک کھلنے اور بند ہونے والے) غلاف کے اندر محفوظ کیا اور ان کے اوپر پلکوں کے بالوں سے سایہ کر دیا۔“

نوٹ: آنکھوں کے عجائبات

آنکھ بے ظاہر پنگ پاگ کی ایک گیند کی طرح نظر آتی ہے جس کے درمیان میں سیاہ رنگ کر پکھر: 1 139

دیا گیا ہو۔ آنکھ کی بیشتر نازک تنصیبات اسی سیاہ رنگ والے علاقے میں پائی جاتی ہیں۔ اس میں سامنے کی طرف قرنیہ (Cornea) کا نیم بیضوی کور ہے۔ اس کے عقب میں آنکھ کی پتلی (Pupil) ہے۔ دیکھنے کے عمل کا آغاز اسی جگہ سے ہوتا ہے۔ قرنیہ روشنی کی لہروں کو مخصوص زاویوں سے موڑتا ہے اور انہیں آنکھ کی پتلی تک پہنچاتا ہے۔ آنکھ کی پتلی ایک درتیجے کی طرح ہے جو خود بے خود سکڑتی اور پھیلتی رہتی ہے۔ تیز دھوپ میں یہ آخری حد تک سکڑ جاتی ہے اور رات کی تاریکی میں پوری طرح کھل جاتی ہے۔

آنکھ کا عدسہ (Lens) بھی قدرت کے عجائب میں سے ایک عجوبہ ہے۔ یہ عدسہ وٹامن کی کسی بیضوی گولی کی طرح ہے اور ہر وقت ایک سیال مادے سے بھرا رہتا ہے۔ اس کے چاروں طرف ناقابلِ تصور حد تک چھوٹے لیکن بے حد مضبوط پٹھے (Muscles) موجود ہیں۔ جب یہ پٹھے سکڑتے ہیں تو آپ قریب کی چیزوں کو واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں اور جب یہ پٹھے پھیلتے ہیں تو آپ دور دراز کی اشیاء کو بہ آسانی دیکھ لیتے ہیں۔

آنکھ کے یہ حساس، نازک لیکن انتہائی مضبوط پٹھے دن میں کتنی مرتبہ سکڑتے اور پھیلتے ہیں، اس کا اندازہ آپ اس طرح کر سکتے ہیں کہ آپ کی آنکھیں ایک عام دن میں کم از کم ایک لاکھ مرتبہ سکڑتی اور پھیلتی ہیں تاکہ آپ بار بار قریب اور دور کی چیزوں کو بہ آسانی دیکھ سکیں۔ اس کا مطلب ہے کہ آنکھ کی پتلی کو کنٹرول کرنے والے یہ پٹھے ہر روز کم از کم ایک لاکھ مرتبہ سکڑتے ہیں اور ایک لاکھ مرتبہ پھیلتے ہیں۔

عدسے کے سامنے اور اس کے پیچھے سیال مادے سے بھرے ہوئے دو حصے ہیں۔ سامنے والا حصہ پانی جیسے شفاف مادے سے بھرا رہتا ہے جب کہ پیچھے والا حصہ انڈے کی سفیدی جیسے شفاف اور سیال مادے سے پُر رہتا ہے۔ یہ دونوں مادے انتہائی شفاف ہوتے ہیں تاکہ کسی بھی مرحلے میں اندر آنے والی روشنی کی لہروں کے راستے میں ذرہ برابر بھی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔

(How Body Works: حوالہ)

خطرات اور ان کا مدارک

آنکھیں ہمارے چہرے پر سامنے کی طرف ہیں اور ہر وقت یہ گرد و غبار، دھویں کے ذرات اور فضائیں تیرتے ہوئے جراثیم کی زد میں رہتی ہیں اسی لیے اللہ تعالیٰ نے آنکھوں کی حفاظت اور صفائی کے لیے ایک خود کار نظام پیدا کیا ہے۔ اس مقصد کے لیے آنکھوں کے اوپر دو غدد موجود ہیں انہیں لیکر یمل گلینڈز (Lacrimal Glands) کہا جاتا ہے۔

یہ دونوں غدد ایک جراثیم کش رطوبت ہر وقت تیار کرتے اور اسے آنکھوں پر پھیلاتے رہتے ہیں۔ یہ دونوں غدد آنسوؤں کے قدرتی سرچشمے ہیں۔ یہ جراثیم کش رطوبت ہر وقت آنکھوں پر پھیلی رہتی ہے اور آنکھ کی بیرونی سطح سے ٹکرانے والی باریک گرد اور دھوئیں کے اجزاء کو آنکھ پر سے ہٹاتی رہتی ہے۔ مہلک جراثیم اس رطوبت میں چپک کر ہلاک ہوتے رہتے ہیں۔

اس کام میں آنکھوں کی پلکیں اور پوٹے بڑا ہم کردار ادا کرتے ہیں۔ آپ ہر منٹ میں تین سے چار مرتبہ پلکیں جھپکتے ہیں۔ تھکن کی صورت میں یہ تعداد بڑھ جاتی ہے۔ پلکیں جھپکنے کے اس عمل میں آپ کے پوٹے کار کے واپر زکی طرح آپ کی آنکھ اور اس کے قرنیے (Cornea) کو ہر منٹ میں تین سے چار مرتبہ نم اور صاف کرتے رہتے ہیں۔ (فرق صرف اتنا ہے کہ کار کے واپر زدائیں باہمیں حرکت کرتے ہیں جب کہ آنکھ کے پوٹے اوپر سے نیچے کی طرف حرکت کرتے ہیں)۔ آنکھوں میں موجود یہ جراثیم کش رطوبت لائی سوزائیم (Lysozyme) کہلاتی ہے۔ اگر یہ رطوبت نہ ہو یا کم پیدا ہو تو آنکھیں خشک ہو جائیں، پوٹے حرکت نہ کر سکیں اور انسان کی زندگی مشکلات سے دوچار ہو جائے۔ (اقتباس: جسم کے عجائب)

اس کے بعد امام جعفر صادق علیہ السلام نے مفضل ابن عمرؓ کو دماغ، کھوپڑی، دل اور جگر کے مقام، بناوٹ اور ان اعضاء کی اہمیت کے بارے میں بتایا۔ لیکن ہم امام علیہ السلام کے کلام کے اس حصے کو تشریحات کے ساتھ آئیندہ ابواب میں اس مقام پر پیش کریں گے جہاں امام علیہ السلام نے ان اعضاء کے بارے میں زیادہ تفصیل کے ساتھ گفتگو فرمائی ہے۔

فی الحال سلسلہ کلام کے اس حصے کے اختتامی جملوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

ہڈیوں کا گودا

امام علیہ السلام نے فرمایا:

”مفضل! اب ذرا غور کرو ہڈیوں میں موجود مغز کی طرف۔

دیکھو اس مغز (Bone Marrow) کو ہڈیوں کے اندر کیوں
محفوظ کیا گیا؟ مغز کو ہڈیوں میں اس لیے رکھا گیا کہ ہڈیاں اسے
شدید گرمی اور شدید سردی سے محفوظ رکھیں۔“

نوٹ: ہڈیاں معدنیات کا اسٹور

غذا کے ذریعے جو معدنیات جسم کے اندر آتی ہیں وہ ہڈیوں کے اندر ہی اسٹور ہوتی ہیں۔
کیلشیم، فاسفورس، معمولی مقدار میں فولاد تابنا، کوبالت اور دوسرے معدنی اجزاء ہڈیوں ہی
میں پائے جاتے ہیں۔ جسم کی روزانہ کی ضروریات کے مطابق معدنیات، جسم کے مختلف حصوں یا
اعضاء کو ہڈیوں میں موجود معدنیات کے اسی اسٹور سے حاصل ہوتی ہیں۔

خون کے سرخ خلیے اور جسم کو بیماریوں سے بچانے والے سفید خلیے ہڈیوں کے گودے میں
تیار ہوتے ہیں۔ جتنی دیر میں آپ پلک جھپکتے ہیں، اتنی دیر میں خون کے سرخ خلیے لاکھوں کی تعداد
میں اپنی زندگی پوری کر کے مر جاتے ہیں لیکن اسی عرصے میں ہڈیوں کے گودے سے اتنے ہی نئے
سرخ خلیے دورانِ خون میں شامل ہو چکے ہوتے ہیں۔

ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو جوڑنے والے مخصوص خلیے بھی ہڈیوں کے گودے میں تیار ہوتے ہیں اور
ہڈی ٹوٹنے کی صورت میں دماغ کے حکم پروہاں سے نکل کر دورانِ خون میں شامل ہو جاتے ہیں اور
ٹوٹی ہوئی ہڈی کے مقام پر آ کر سینٹ کی طرح اس کے ارد گرد چپکتے جاتے ہیں۔

جب ہڈی ہر طرف سے جڑ کر مضبوط ہو جاتی ہے تو ہڈیوں کے گودے سے دوسری طرح کے

خلیے دورانِ خون کے ذریعے "حادثہ کے مقام" تک پہنچنے لگتے ہیں۔ یہ خلیے ہڈی کے ارڈر جمع ہونے والے اضافی "سینٹ" کو صاف کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

ان خلیوں کی یادداشت میں ہڈی کی اصل شکل محفوظ ہوتی ہے۔ یہ صرف ہڈی کے ارڈر موجود مصالحے کو کھاتے ہیں تاکہ ہڈی اصل شکل میں موجود رہے۔ اس کے بعد یہ خلیے ہڈیوں کے گودے میں واپس چلے جاتے ہیں۔ (حوالہ: جسم کے عجائبات)

ہڈیوں کے گودے کی اہمیت

ہڈیوں کا یہ گودا معلوم اور نامعلوم وجوہات کے سبب کبھی کبھی جسم کے دفاعی نظام کے سفید خلیے بنانا "بھول" جاتا ہے۔ جسم کے ارڈر موجود طرح طرح کی بیماریوں کے جراشیم جو ہر وقت جسم کے اندر داخل ہوتے رہتے ہیں جسم کا دفاعی نظام انہیں فنا کرتا رہتا ہے لیکن اگر ہڈیوں کا گودا دفاعی نظام میں کام آنے والے سفید خلیے بنانے میں ناکام ہو جائے تو ایک معمولی سی بیماری بھی انسان کے لیے جان لیوا ثابت ہو سکتی ہے۔ ایسے مریضوں کو چوبیں گھٹنے جراشیم سے پاک بند چیمبر میں زندگی گزارنا پڑتی ہے اور جراشیم سے پاک غذا اور پانی استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اس بیماری کا علاج ہڈیوں کے گودے کی تبدیلی ہوتا ہے۔ ایسے مریض کو صحت یاب ہونے تک زندہ رہنے کے لیے روزانہ کم و بیش ایک ڈیڑھ لاکھ روپے کے اخراجات برداشت کرنا پڑتے ہیں۔ ایسا مریض صحت یاب ہونے سے پہلے نہ کہیں آسکتا ہے، نہ جاسکتا ہے، نہ کسی سے ہاتھ ملا سکتا ہے، نہ عام غذا اور پانی استعمال کر سکتا ہے۔ (اقتباس: How Body Works)

یہ ہے ہڈیوں کے مغز، گودے یعنی (Bone Marrow) کی اہمیت جس کی طرف امام جعفر صادق علیہ السلام نے مفضل ابن عمرؓ کو متوجہ فرمایا کہ اس مغز کو ہڈیوں میں اس لیے محفوظ رکھا گیا تاکہ یہ شدید گرمی میں پکھل نہ جائے اور شدید سردی میں جم نہ سکے۔ ظاہر ہے کہ اگر ہڈیوں کا یہ گودا جم جائے یا پکھل جائے تو انسان کا جسم باقی تمام اعضاء کے صحیح سالم ہونے کے باوجود چند ہی دنوں میں زیر زمین منتقل ہو سکتا ہے۔

انسان کی دو اقسام، مرد اور عورت

مرد اور عورت کی تخلیق میں اللہ احسن الائقین کے وجود کی بے شمار نشانیاں موجود ہیں۔ اگر ماڈہ یا طبیعت (یعنی نیچر) نے انسانوں کو تخلیق کیا ہوتا تو کیا بے جان، بے شعور مادے میں یہ صلاحیت ہو سکتی تھی کہ وہ انسان کو دو مختلف اقسام یعنی مرد اور عورت کی شکل میں پیدا کرے اور ایک دوسرے کی ضروریات کے مطابق ان کے الگ الگ قسم کے اعضاء خاص مناسبتوں کے ساتھ بنائے اور ان دونوں اقسام کے انسانوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے کشش پیدا ہوا اور پھر اس سے مطلوبہ نتائج حاصل کیے جائیں۔

اس حوالے سے امام علیہ السلام نے مفضل بن عمر سے فرمایا:

”مفضل کیا تم نے کبھی غور کیا کہ انسان کی دو الگ الگ اقسام عورت اور مرد کی شکل میں کیوں پیدا کی گئیں۔ کس نے انہیں عورت اور مرد کی صورت پیدا کیا (تاکہ ان دو اقسام کے اختلاط سے نسل انسانی بڑھتی رہے۔ دنیا سے معدوم نہ ہونے پائے)۔

انسانوں کو مرد و عورت کی شکل میں اسی ذات نے پیدا کیا جس نے انسانوں کو نسل بڑھانے والا بنایا۔ جس نے اس انسان کو امید والا پیدا کیا۔ (دنیا میں اگر صرف مرد ہی ہوتے یا صرف عورتیں ہی ہوتیں تو نسل انسانی کی افزائش کا کوئی ذریعہ نہ ہوتا)۔

اسی طرح تم حیوانات پر غور کرو کہ ان میں صرف نر یا صرف

مادہ ہی کیوں پیدا نہیں ہوتی! مفضل دیکھو۔ حیوانات میں اگر صرف نر یا صرف مادہ پیدا ہوتے تو کیا ان کی نسل برقرارہ سکتی تھی؟ اسی لیے ان کے بعض بچے نر پیدا ہوتے ہیں بعض مادہ۔

الگ الگ طرح کے اعضاء

امام علیہ السلام نے فرمایا:

”مفضل اگر تم کسی دروازے کے دو کواڑوں یا پاؤں میں سے کسی ایک کو الگ رکھا دیکھو جس میں کنڈی لگی ہوئی ہو تو کیا تمہارے ذہن میں یہ خیال نہیں آئے گا اگر دروازے کے ایک پٹ میں کنڈی موجود ہے تو یقیناً اس دروازے کا دوسرا حصہ بھی ہو گا جس میں اس کنڈی کو لگایا جاتا ہو گا تاکہ دروازہ اچھی طرح بند ہو سکے۔

تم دروازے کے اس ایک پٹ کو دیکھ کر سمجھ جاؤ گے کہ یہ دروازے کا ایک حصہ ہے۔ اسے دوسرے حصے سے جوڑا جائے گا تاکہ ان دونوں کے ملنے سے مطلوبہ فائدہ حاصل کیا جاسکے۔

اسی طرح تم نر حیوان کو دیکھو گے کہ وہ کسی جوڑے کا ایک فرد ہے۔ جوڑے کا دوسرا فرد اسی حیوان کی نسل کی مادہ ہے۔ جب یہ دونوں مل کر ایک خاص عمل سے گزرتے ہیں تو اس سے نئی نسل پیدا ہوتی ہے۔ بقاء نسل کا راز ایک ہی نسل کے دو ایک دوسرے سے کسی قدر مختلف حیوانوں کے تخلیق کے عمل سے

گزرنے میں پوشیدہ ہے۔“

(ذراغور فرمائیں کہ دوسری صدی ہجری یا ساتویں صدی عیسوی میں اس طرح کے سوالات کیا کسی عام آدمی کے ذہن میں پیدا ہو سکتے تھے یا اس طرح کے سوالات اور ان کے جوابات کے بارے میں یونانی علماء کی تاریخ میں آپ نے کوئی ایسی چیز پڑھی ہے؟)

نوٹ: انسان کی دو اقسام

آپ نے کبھی غور کیا کہ بچہ پیدا ہوتا ہے تو کبھی وہ لڑکا کیوں ہوتا ہے اور کبھی لڑکی کیوں پیدا ہوتی ہے؟ لڑکا اور لڑکی کس طرح بنتے ہیں؟ دونوں کی الگ الگ شناخت، بناوٹ اور دونوں میں الگ الگ طرح کی خصوصیات کس طرح پیدا ہوتی ہیں؟

یہ سب، بڑے حیران کن مرحلے ہیں، اللہ تعالیٰ کی شان خلائقیت کے عظیم نمونے، عقل کو ششدرا کر دینے والے شاہکار، اس کی انجینئرنگ کے بے مثال عجائبات، لیکن ہم چونکہ اس عمل کو اسی طرح دیکھتے آئے ہیں اس لیے ہمارے لیے یہ ایک عامی بات ہے۔

آئیے دیکھتے ہیں کہ اللہ کا یہ حیران کن معجزہ کس طرح رونما ہوتا ہے کہ دنیا میں آنے والے انسانوں میں سے کوئی مرد بن جاتا ہے اور کوئی عورت۔

ہم گزشتہ ابواب میں قارئین کو ڈی این اے کے بارے میں بتا چکے ہیں کہ انسان جسمانی طور پر جو کچھ بنتا ہے انھی ہدایات کے مطابق بنتا ہے جو اس کے ڈی این اے پر موجود ہوتی ہیں۔ ہر نیا انسان جو اس دنیا میں آتا ہے، ماں اور باپ کی طرف سے آنے والے 23+23 کروموسومز سے مل کر بننے والے ایک مخلوط خلیے کی صورت اپنی زندگی کا آغاز کرتا ہے۔ یہ خلیہ اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ اسے لائٹ میکرو اسکوپ سے ہی کسی قدر دیکھا جاسکتا ہے۔ اس کے تفصیلی معانے کے لیے الیکٹران خرد بین کی ضرورت پڑتی ہے جو کسی بھی چیز کی تصور کو پچاہ ہزار گناہ اس سے بھی زیادہ بڑا کر کے دکھا سکتی ہے۔

عالمِ غیب میں جنس کا تعین

اس ننھے سے خلیے میں گل 46 کریموسوز ہوتے ہیں جوڑی این اے کے دھاگوں پر پائے جاتے ہیں۔ پھر اس خلیے میں اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے (جس کی تفصیل بتانا اس وقت ممکن نہیں ہے) اور یہ سب کچھ ہماری حدِ بصارت سے بالاتر ہوتا ہے۔ گویا یہ سب کچھ ہمارے لیے ایک طرح کے ”غیب“ کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس غیب کے پردے میں وہ مخصوص ہدایات بھی ہوتی ہیں جو کسی انسان کی جنس کا تعین کرتی ہیں کہ اس کا رخانہ قدرت میں کون سا کردار ادا کرنا ہے۔ اسے لڑکا بننا ہے یا لڑکی یعنی مردیا عورت۔

اگر اسے مرد کا کردار ادا کرنا ہے تو اس کے لیے اسے اس کی ضرورت کے مطابق نادر و نایاب اعضاء دیے جاتے ہیں اور اگر اسے عورت کا کردار ادا کرنا ہے تو اسے ان خوبیوں سے نوازا جاتا ہے کہ یہ آنے والی نسلوں کو اپنے وجود میں جنم دے سکے اور اس دنیا میں نئی نسل کو قیام و طعام کی ابتدائی سہولتیں فراہم کر سکے۔

جنس کا تعین باپ کی طرف سے آنے والے مخصوص کریموسوز کے ذریعے ہوتا ہے۔ یہ افزائش نسل کی صلاحیت عطا کرنے والے کریموسوز ہیں۔ انہیں سیکس کریموسوز بھی کہا جاتا ہے۔ یہ کریموسوز مرد اور عورت دونوں میں ہوتے ہیں اور دونوں کے کریموسوز کے ملنے سے ہی نئی زندگی کے وجود میں آنے کے امکانات پیدا ہوتے ہیں۔

لڑکا کیوں؟ یا لڑکی کیوں؟

خواتین کے جسم میں یہ کریموسوز 2 ہوتے ہیں اور دونوں ہی X کریموسوز کھلاتے ہیں۔ مردوں کے جسم میں بھی اس طرح کے 2 کریموسوز پائے جاتے ہیں لیکن ان میں سے ایک X کریموسوز ہوتا ہے اور دوسرا Y کریموسوز کھلاتا ہے۔ افزائش نسل کے حیران کن نظام میں جب ماں اور باپ کے یہ کریموسوز ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو اگر باپ کا X کریموسوز ماں کے X

کروموزوم سے مل گیا تو یہ اللہ کی ایک رحمت ہوتی ہے اور ان کے ملنے سے لڑکی پیدا ہوگی۔ اس کے برعکس اگر باپ کا ۷ کروموزوم مال کے X کروموزوم سے مل گیا تو یہ اللہ کی نعمت ہوگی اور ان کے ملنے سے لڑکا پیدا ہوگا۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ جنس کا تعین باپ کے کروموزوم سے ہوتا ہے۔ لڑکی پیدا ہونے میں عورت کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔ یہ معاملہ اللہ تعالیٰ نے مرد کے پاس رکھا ہے۔

X اور X کروموزوم کے ملنے سے لڑکی کیوں پیدا ہوتی ہے اور X اور Y کروموزوم کے ملنے سے لڑکا کیوں پیدا ہوتا ہے.....؟ دراصل ہوتا یہ ہے کہ حمل کے ابتدائی ہفتے میں X اور Y کے ملاب سے تخلیق پانے والے ایمبرو (Embryo) میں اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی مصلحت و مشیت کے مطابق ایک خاص جین آن (On) ہو جاتی ہے۔ اس جین (Gene) کو SRY جین کا نام دیا گیا ہے۔ یہ جین Y کروموزوم پر پائی جاتی ہے۔

جین کے بارے میں آپ گزشتہ ابواب میں پڑھ چکے ہیں کہ جین دراصل ایک ہدایت ہوتی ہے۔ DNA پر موجود ان جیز یا ہدایات کے مطابق، ہی جسم انسانی کی تعمیر و تشکیل ہوتی رہتی ہے۔ بہر حال SRY نامی اس جین کے ذریعے DNA یہ ہدایت یا حکم جاری کرتا ہے کہ گوشت کے اس نفخے سے لوہڑے کو لڑکا بنائے جانے کے عمل کا آغاز کر دیا جائے۔ اس حکم کے ملتے ہی لڑکے کی تخلیق کے لیے رحم مادر میں عقل کو ششدرا کر دینے والے معجزے رونما ہونے لگتے ہیں۔

مرد اور عورت دونوں ہی انسان ہیں لیکن اللہ تعالیٰ انہیں عام اعضاء مثل ادل، جگر، پھیپھڑوں، ہاتھ، پیر، وغیرہ کے علاوہ ان کی ضروریات اور مطلوبہ خدمات کی انجام دہی کے لیے کچھ الگ الگ قسم کے اعضاء اور صلاحیتیں بھی عطا کرتا ہے، جن کی مدد سے نسل انسانی آگے بڑھتی ہے اور یہ کہ آبی زندگی سے معمور نظر آتا ہے۔

ضرورت کے مطابق اعضاء

اگر چند نادیدہ خلیوں کے اس مجموعے کو لڑکی بننا ہوتا ہے تو SRY نامی یہ آن نہیں ہوتی۔

ایسی صورت میں DNA کے برعکس ہدایات جاری کرتا ہے اور خلیوں کے اس مجموعے میں قدرت کے وہ احکامات جاری ہوتے ہیں جن کے ذریعے گوشت کے اس نئھے سے ٹکڑے کے اندر ان اعضاء اور صلاحیتوں کی تشكیل و تعمیر ہونے لگتی ہے جو ایک عورت کے وجود کے لیے ناجائز ہیں اور نو ماہ یا اس سے ذرا کم مدت میں ماں باپ کے گھر لڑکی پیدا ہوتی ہے اور سارے ماحول کو اللہ تعالیٰ کی رحمتوں سے معمور کر دیتی ہے۔

حیران کن بات یہ بھی ہے کہ لڑکی ہو یا لڑکا، جب یہ پیدا ہوتے ہیں تو اس وقت ان میں پچھلی نسل کی وہ تمام خصوصیات محفوظ ہوتی ہیں جنہیں ان کے ذریعے آیندہ نسلوں میں منتقل ہونا ہوتا ہے۔ (اقتباس از: ڈی این اے۔ جسم کی کتاب ہدایت)

امام علیہ السلام نے اپنی گفتگو میں مفضل ابن عمرؓ کو مرد اور عورت کے الگ الگ طرح کے اعضاء کی جانب بھی متوجہ فرمایا کہ ان دونوں کے اعضاء کس طرح ایک دوسرے کی مناسبتوں اور ضروریات کے مطابق کامل ترین شکل میں بنائے گئے۔ بتانے کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ تمام مخلوقات کا ایک ہی خالق ہے جس نے تخلیق انسانی میں ایک خاص منصوبے کے مطابق مناسب حال اعضاء تخلیق فرمائے (اس سلسلے میں اگر ہمارے قارئین تفصیلات جاننا چاہیں تو ہماری کتاب ”جسم کے عجائب“ کا مطالعہ فرمائیں)

اللہ انہیں ہلاک کرے

امام علیہ السلام نے فرمایا:

”اللہ تعالیٰ ان جاہلوں کو ہلاک کرے جو فلسفی بننے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن ان دل کے انہوں کو انسان اور دوسرے ذی حیات کی عجیب و غریب خلقت اور ساخت میں خالق عالم کی نشانیاں نظر نہیں آتیں؟“

ان کی ضد اور جہالت کا عالم یہ ہے کہ کہتے ہیں کہ خلقتِ عالم میں کسی مدد بر کی تدبیر (پلانگ) نہیں، اس میں کسی ارادے والے کا ارادہ اور منصوبہ بنانے والے کا کوئی منصوبہ ہی نہیں ہے، (بلکہ یہ جہاں، یہ دنیا اور اس میں موجود مختلف احیان خود بے خود پیدا ہو گئی ہیں۔)

اگلے باب میں ہم آپ کو بتائیں گے کہ امام علیہ السلام نے افزائش نسل کے نظام کے بارے میں کیا حیران کن اکشافات فرمائے ہیں۔ وہ ایسے سائنسی اکشافات ہیں جن کے بارے میں نزولِ قرآن سے صدیوں پہلے اور صدیوں بعد بھی اس کرتہ ارض پر کسی انسان کو کچھ معلوم نہیں تھا۔

افزائش نسل کے حیران کن طریقے

گزشتہ باب میں ہم نے امام کے پیکھر کے اُس حصے کو نقل کیا تھا جس میں آپ نے انسان کی دو اقسام یعنی عورت اور مرد کی خلقت، ان کے الگ الگ اعضاء اور ان اعضاء کی ایک دوسرے سے ہم آہنگی اور مناسبوں کے حوالے سے اپنے شاگرد مفضل ابن عمرؓ کو متوجہ فرمایا تھا۔ واضح رہے کہ اس حوالے سے امام نے کئی اہم باتوں کی طرف بھی متوجہ فرمایا لیکن بعض اسباب کی بناء پر ہم نے وہ جملے اسی طرح نقل نہیں کیے۔ اس کے لیے اصل کتاب سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔

حیران کن انکشافات

اس کے بعد امام جعفر صادق علیہ السلام نے ایک عجیب معجزانہ کلام ارشاد فرمایا۔ یہ ایک ایسا کلام اور ایک ایسا موضوع تھا کہ اس کے بارے میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے پہلے قرآن مجید نے اپنی آیات میں انسانوں کو اس جانب اشارتاً متوجہ کیا تھا یا پھر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امیر المؤمنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے اپنے خطبات میں اس وقت کے لوگوں کے علم اور ذہنی سطح کے مطابق انھیں سرسری طور پر آگاہ کیا تھا۔ نزول قرآن سے صدیوں پہلے اور صدیوں بعد بھی کرہ ارض پر موجود کسی تہذیب، ملک اور شہر میں کسی انسان کو اس موضوع کے بارے میں سرسری سا بھی علم نہیں تھا۔
یہی انکشافات آج ہمارا موضوع ہیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کا موضوع گفتگو حیوانوں میں افزائش نسل ہے۔ اس حوالے سے گفتگو فرماتے ہوئے آپ نے مفضل ابن عمرؓ سے فرمایا:

”مفضل! یہ تو افزائش نسل کا ایک طریقہ ہے کہ (بچے ماں

باپ کے اختلاط سے پیدا ہوں) لیکن اب ذرا ان جانداروں پر بھی غور کرو جن کی نسل کی بقاء کے لیے ماں باپ دونوں کا ایک ساتھ ہونا ضروری نہیں ہے۔

ان جانداروں کی پیدائش خاص مادوں کے جمع ہونے اور اس میں ایک خاص قوت کے پہنچ جانے کے عمل سے مکمل ہو جاتی ہے۔ ان جانداروں میں نرم امادہ کے درمیان تمیز نہیں کی جاسکتی۔ مثلاً زنبور، انہیں دیکھو تو (ظاہراً) معلوم کرنا مشکل ہو گا کہ کون نر ہے اور کون مادہ۔

نوٹ: مادوں کے جمع ہونے سے پیدائش

امام علیہ السلام نے اس حوالے سے جو حیران کن اکتشافات فرمائے ان سب کا احاطہ کرنا تو ہمارے لیے ممکن نہیں ہے لیکن اس کی دو مشاہیں ایسی ہیں جن کے بارے میں آج سائنس پڑھنے والے بچے بھی جانتے ہیں اور وہ ہیں بیکٹیریا اور وائرس۔

1683 عیسوی تک ان کے بارے میں دنیا کا کوئی انسان کچھ نہیں جانتا تھا۔ بیکٹیریا کو سب سے پہلے ہالینڈ کے ایک بیدار مفرزان انسان ”انھوئی وون لیون“ نے اپنے محمد بشیشے کی مدد سے دیکھا اور انیسویں صدی عیسوی میں جرمنی کے ماہر حیاتیات ”راینر کاخ“ نے ثابت کیا کہ بعض بیکٹیریا بیماریاں پیدا کرتے ہیں۔

بیکٹیریا نامی مخلوق پر ایک نظر

بیکٹیریا یک خلوی یعنی ایک سیل Cell والی مخلوق ہے اور خود اپنے بل بوتے پر زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ دنیا میں کوئی جگہ حتیٰ کہ دوسرے سیارے اور ستارے بھی بیکٹیریا سے خالی نہیں

ہیں۔ یہ ہر جگہ، ماحول، ہر درجہ حرارت میں زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ برفانی علاقے اور آتش فشاںی چنانیں بھی ان سے خالی نہیں ہیں۔ سائنس دانوں کے مطابق بیکٹیریا زندگی کی ابتدائی شکل ہیں۔ (یہ بیکٹیریا کہاں سے آئے؟ اس کا جواب کسی سائنس دان کے پاس نہیں ہے)۔

ایک بیکٹیریا سے دوسرا بیکٹیریا پیدا ہوتا ہے

بیکٹیریا میں نرم مادہ بس ہوتے، یہ بس ایک مخلوق ہوتے ہیں اور ایک بیکٹیریا سے دوسرا بیکٹیریم پیدا ہوتا ہے۔ ان کا جم مولیٰ سی جھلی سے ڈھکا ہوا ہوتا ہے۔ ان کے جسم میں نہ منہ ہوتا ہے، نہ کوئی سوراخ۔ اس کے باوجہ دیہ نیا کی کم و بیش ہر چیز کو کھاپی کر چٹ کر جاتے ہیں۔ یہ چیزوں کو کھانے کے لیے یہ مختلف کیمیکلز اور رامگز (خامروں) کا استعمال کرتے ہیں، جن کی وجہ سے گوشت، لکڑی، پھل، انسانوں اور جانوروں۔ جسم، تیل، گوبر، ڈیزل، انسانی فضلہ، ہر چیز سیال مادے میں تبدیل ہو جاتی ہے اور یہ سیال مادہ بیکٹیریا کے جسم کی بیرونی جھلی کے اندر جذب ہو جاتا ہے۔

بیکٹیریا اپنی نسل میں انتہائی تیزی سے اضافہ کرتے ہیں۔ مثلاً ای کولائی (E.coli) نامی بیکٹیریا (یعنی بیکٹریم) بیس منٹ کے بعد ایک سے دو ہو جاتے ہیں اور اگلے بیس منٹ میں چار۔ ان کی افزائش نسل میں اگر اسی رفتار سے اضافہ ہوتا رہے تو اس حساب سے صرف 43 گھنٹوں میں ان کی تعداد اتنی ہو جائے گی کہ یہ سارے کرہ ارض کو ڈھک دیں گے۔ یعنی یہ بیکٹیریا زمین کے اور اگر انہیں مزید دو گھنٹے اسی رفتار سے افزائش نسل کرنے کے موقع فراہم رہیں تو ان کا وزن زمین کے مجموعی وزن یعنی $1,090,000,000,000,000,000,000$ کیوبک میٹر کے علاقے پر پھیل جائیں گے اور اگر انہیں مزید دو گھنٹے اسی رفتار سے افزائش نسل کرنے کے موقع فراہم رہیں تو ان کا وزن 600,000,000,000,000,000,000 ٹن کے برابر ہو جائے گا۔ لیکن اللہ کا بنایا ہوا ایک نظام ان بیکٹیریا زمیں کی تعداد کو کنٹرول میں رکھتا ہے۔

ایک اور مثال..... وا رس

جہاں تک وا رس کا تعلق ہے تو اللہ کی یہ مخلوق بیکٹیریا سے بھی زیادہ حیران کن خصوصیات رکھتی ہے۔ وا رس کا پتا ہالینڈ ہی کے ایک ماہر نباتیات مارٹنیس نے اٹھارویں صدی میں ایک تحقیق

کے دوران لگایا۔ وائرس بیکٹیریا کی طرح کی مخلوق نہیں ہے لیکن ان میں بھی افزائش نسل کے لیے زر و مادہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وائرس محض کچھ کیمیکلز کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ انہیں اپنی نسل کو بڑھانے کے لیے کبی ذی حیات کے جسم کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ذی حیات پیڑ، پودے، جانور، انسان حتیٰ کہ بیکٹیریا بھی ہو سکتے ہیں۔

وائرس کسی بھی ذی حیات کے جسم میں داخل ہو کر اس جسم کی حیاتیاتی مشینری کو کنٹرول کر لیتے ہیں اور اس کی مدد سے اپنی افزائش نسل کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ وائرس کے اندر ایک DNA یا RNA ہوتا ہے۔ وہ اپنے DNA کو ذی حیات کے خلیے میں داخل کر کے اپنی کاپیاں بنانا شروع کر دیتے ہیں۔ ماہرین کہتے ہیں کہ وائرس ایک خاص قسم کی جینز GENES کا مجموعہ ہیں جو زندہ خلیوں سے نکلی اور اس سے ایک الگ طرح کی مخلوق وجود میں آگئی۔ ایسی مخلوق جو ذاتی حیثیت میں ”بے جان، بے روح“ کی جاسکتی ہے لیکن یہ کسی ذی حیات کے جسم میں داخل ہو جائے تو بہت سی صورتوں میں اسے زندگی سے محروم کر دیتی ہے۔ ایڈز کا وائرس اس کی ایک مثال ہے۔

یہ دو مثالیں ہم نے امام جعفر صادق علیہ السلام کے ارشاد کے ارشاد کے اس حصے کی وضاحت کے لیے پیش کیں جس میں آپ نے ماذوں کے جمع ہونے اور ان میں ایک خاص قوت کے پہنچ جانے سے افزائش نسل کا ذکر فرمایا تھا۔ اس میں یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ اس طرح کے جانداروں میں نرمومادہ ہوتے ہی نہیں ہیں۔

نر حیوان کا ہونا ضروری نہیں

عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ کسی جانور کی افزائش نسل کے لیے ماں باپ دونوں کا ہونا ضروری ہے لیکن اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ایسی مخلوقات بھی پیدا کی ہیں جو افزائش نسل کے ان اصولوں سے بالاتر ہیں۔ ایسے ذی حیات کو پر تھیبو جنیس (PARTHENO GENESIS) ذی حیات کہا جاتا ہے۔ پر تھیبو جنیس، دراصل یونانی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے، کنواری یا باکرہ یا غیر شادی شدہ۔ اس طرح کے بہت سے ذی حیات اس کرہ ارض پر موجود ہیں جن میں

افزائش نسل کے لیے باپ کی ضرورت نہیں ہوتی مثلاً:

۱۔ ٹرکی مرغی: مرغے کے بغیر بار آور انڈے دیتی ہے۔ ان انڈوں سے جو بچے نکلتے ہیں وہ ہو بہاپنی ماں کی کاپی ہوتے ہیں۔

۲۔ ہمیرہ ہیڈ شارک اور ٹپ شارک: یہ مچھلیاں بھی نر مچھلی کے بغیر بچے پیدا کرتی ہیں۔ ان کے DNA ٹیسٹ سے معلوم ہوا کہ بچے کے اندر نر مچھلی کی جانب سے آنے والے کروموسوم موجود ہی نہیں تھے۔

۳۔ بڑی چھپکلیاں: جنہیں ڈریگن کہا جاتا ہے، ان کی بعض اقسام میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔

۴۔ بچھوکی بعض اقسام میں بھی یہی خصوصیت پائی گئی ہے۔

افزائش نسل کے دوسرے حیران کن طریقے

۱۔ مچھلیوں کی کئی اقسام ایسی ہیں جو مادہ مچھلی پیدا ہوتی ہیں لیکن بڑے ہونے کے بعد یہ نر مچھلی میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح اس کے بر عکس بھی ہوتا ہے۔ مچھلیوں کی بعض اقسام افزاش نسل کے ایک موسم میں زر ہوتی ہیں اور اگلے موسم میں مادہ ہو جاتی ہیں۔

ان کے علاوہ سمندر میں ایسی مچھلیاں بھی پائی جاتی ہیں جو پندرہ بیس مادہ اور ایک نر کے گروپ میں رہتی ہیں۔ نر مچھلی کا سائز بڑا ہوتا ہے اور اس کے رنگ بھی زیادہ ہوتے ہیں لیکن اگر نر مچھلی کسی سبب سے مرجائے تو اس صورت میں مادہ مچھلیوں میں سے کوئی ایک مچھلی نر مچھلی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس کے رنگ بھی بدل جاتے ہیں اور سائز بھی۔

۲۔ سب سے حیران کن معاملہ کچھوں کی بعض اقسام کا ہے۔ ان کچھوں کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ ہر کچھوے کے جسم میں زر کچھوے کے اعضاء بھی ہوتے ہیں اور مادہ کچھوے کے بھی۔ یعنی ایک ہی کچھوانز بھی ہوتا ہے اور مادہ بھی۔

(اس حوالے سے تفصیلات جاننا چاہیں تو ہماری کتاب ”DNA جسم کی کتاب ہدایت“ کا مطالعہ فرمائیں)

انسان خود ایک زندہ مجھزہ ہے

جسم انسانی اللہ تعالیٰ کا ایک زندہ مجھزہ ہے۔ ایک ایسا مجھزہ جو ہر شخص کے اپنے وجود کا حصہ ہے۔ کوئی نہیں سوچتا کہ وہ کس طرح اس عمر تک پہنچا اور کس طرح زندہ ہے۔ اس نے کس طرح نشوونما پائی۔ اس کی جسمانی ضروریات کے مطابق غذا اسے کہاں سے، کس طرح حاصل ہوتی ہے۔ کس طرح اسے بھوک لگتی ہے۔ کس طرح غذا اس کی بھوک مٹاٹی اور پانی اس کی پیاس۔ بجھا کر اس کے جسم میں ہر لمحے کس قدر حیران کن کیمیائی مجھزے رونما کرتا ہے، جانوروں کا گوشت، سبزیاں، پھل اور انماج کس طرح اس کے جسم کا حصہ بن جاتے ہیں؟ یہ باتیں سوچنے کا ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ ہم اللہ کے اس عظیم مجھزے پر غور نہیں کرتے۔

بہر حال جسم انسانی اللہ تعالیٰ کے وجود کی عظیم نشانی ہے۔ اسی لیے امام جعفر صادق علیہ السلام نے جب اثباتِ وجودِ خدا کے دلائل مفضل ابن عمرؓ کے سامنے بیان فرمائے تو اس کے لیے سب سے پہلے جسم انسانی، اس کے اعضاء کی بناؤٹ اور ان کی کارکردگی کو بیان کرنا شروع کیا۔ امام علیہ السلام نے اس وقت کے موجود علم اور اس دور کے انسان کی علمی سطح کے مطابق مختصرًا لیکن انتہائی جامع معلومات فراہم کیں۔ یہ ایسی معلومات تھیں کہ اس دور سے صد یوں پہلے اور صد یوں بعد تک کسی فلسفی، سائنسدان یا کسی ماہر حیاتیات نے انہیں اس طرح نہ سمجھا تھا اور نہ بیان کیا تھا۔ اس باب میں ہم امام جعفر صادق علیہ السلام کے ان ارشادات کو رقم کر رہے ہیں جن میں امام علیہ السلام نے ناخنوں، جلد کی مختلف اقسام اور بالوں کے بارے میں مفضل ابن عمرؓ کو بتایا کہ ان کا ہونا کیوں ضروری تھا اور ان کے پیدا کرنے میں اللہ احسن الخلقین کی کس قدر عظیم حکمتیں مصلحتیں موجود ہیں۔

ناخن کیوں پیدا کیے گئے؟

امام علیہ السلام نے فرمایا:

”مفضل! کیا کبھی تم نے اس بات پر غور کیا کہ انگلیوں پر
ناخن کیوں پیدا کیے گئے؟ یہ ناخن اللہ تعالیٰ نے انگلیوں پر اس
لیے پیدا کیے کہ انگلیوں کو چوت لگنے سے محفوظ رکھیں اور کام
کرنے میں مدد فراہم کریں۔“

نوٹ: ناخن کیا ہیں؟

ناخن دراصل ہمارے جسم کی جلد ہی میں سے آگے بڑھتے ہیں اور ایک خاص سائز اختیار کرنے کے بعد یہ مردہ ہو جاتے ہیں۔ ہمارا سارا جسم پروٹین (گوشت) سے بنा ہے۔ ناخن میں جو پروٹین (گوشت کی قسم) استعمال ہوتی ہے اسے سائنسی زبان میں کرے ٹین (KERATIN) کہا جاتا ہے۔ ہمارے بال بھی پروٹین کی اسی قسم سے پیدا ہوتے ہیں۔ بکری کے کھر، بیٹخ کے پر، چوپا یوں کے سینگ بھی اسی پروٹین سے بنتے ہیں۔ (بالوں کے بارے میں ہم سائنسی معلومات گزشتہ کسی باب میں بیان کر چکے ہیں)

ناختوں کے بڑھنے کی رفتار ہر شخص میں الگ ہوتی ہے۔ اسی طرح دائیں اور بائیں ہاتھ کے ناخن بھی یکساں رفتار سے نہیں بڑھتے۔ جس ہاتھ سے آپ زیادہ کام کرتے ہیں، اس ہاتھ کے ناخن زیادہ تیزی سے بڑھتے ہیں۔

اگر ناخن انگلیوں پر نہ ہوں تو انگلیوں کے زخمی ہونے کے امکانات بڑھ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ناخن انگلیوں کے سروں کو خاص طرح کی سختی فراہم کرتے ہیں جس کی عدم موجودگی میں قلم پکڑنا، گاڑی کا اسٹیرنگ سنبھالنا، کوئی باریک چیز زمین سے اٹھانا ممکن نہ ہوتا۔ مثلاً سوئی اٹھانا، سوئی میں دھا گاؤالنا اور ہزاروں دوسرے کام۔

ناخن اور بال کا ٹیکیوں جاتے ہیں؟

امام علیہ السلام نے فرمایا:

”مفضل! اس بات پر غور کرو اور اس سمجھو کہ بالوں اور ناخنوں کا منڈنا اور کٹنا کیوں ضروری ہے؟ اور اس میں انسان کے لیے کیا بہتری ہے؟

دیکھو! یہ دونوں بڑھتے اور زیادہ ہوتے رہتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان کے اوپری حصے میں کمی کی جائے۔ تم دیکھو! بال (جلد سے نکلتے ہی) اور ناخن ایک خاص حد تک بڑھنے کے بعد مردہ ہو جاتے ہیں تاکہ آدمی کو انہیں کاٹنے میں تکلیف نہ ہو۔

اگر بالوں اور ناخنوں کے کٹنے میں (ذراسی بھی) تکلیف ہوا کرتی تو انسان دو طرح کی زحمتوں کے درمیان پھنس جاتا۔ یا تو وہ انہیں بڑھنے دیتا (اور انسان سے زیادہ جانور معلوم ہونے لگتا) اور جب یہ زیادہ بڑھ جایا کرتے تو بڑی زحمتوں میں مبتلا ہو جاتا یا اگر وہ انہیں کٹوانے کا فیصلہ کر لیتا تو اسے کٹوانے کی تکلیف برداشت کرنا پڑتی۔“

مفضل ابن عمرؓ نے عرض کی۔ ”آقا! یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ انہیں ایسا بناتا کہ یہ بڑھا ہی نہ کرتے کہ انسانوں کو انہیں

کٹوانے کی ضرورت پیش آئے؟“

کئی امراض بالوں اور ناخنوں کے ذریعے دور ہوتے ہیں
امام علیہ السلام نے جواب دیا۔

”اللہ تعالیٰ یقیناً ایسا کرنے پر قادر ہے لیکن ہر کام میں اس کی کچھ مصلحتیں ہیں (اور یہ بندوں ہی کے فائدے کے لیے ہیں) بندے ان مصلحتوں اور نعمتوں کو نہیں جانتے۔ اگر جانتے تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکرداد کیا کرتے۔

مفضل! بات دراصل یہ ہے کہ جسم انسانی کے بہت سے امراض اور تکالیف بالوں کے ذریعے دور ہوتے ہیں جو (جلد کے) مسامات سے باہر نکلتے ہیں اور انگلیوں کے امراض ان ناخنوں کے بڑھنے کی وجہ سے دور ہوتے ہیں۔ ہفتے میں ایک مرتبہ بال کٹوانے، نورہ لگانے اور ناخن ترشوانے کا حکم ماسی لیے دیا گیا ہے تاکہ بال اور ناخن جلدی جلدی نکلیں اور جسم کے اندر موجود بیماریاں (فاسد زہر یا مادے) ان کے ذریعے جسم سے خارج ہوتے رہیں۔

بال اور ناخن جب ضرورت سے زیادہ بڑھ جائیں تو ایسی صورت میں بھی انسان کو بیماریوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اگر ان کے بڑھنے کی رفتار معمول سے کم ہو جائے تو ایسی

صورت میں بھی طرح طرح کے درد اور امراض پیدا ہو سکتے ہیں۔“

بال جسم پر ہر جگہ ایک سے نہیں ہیں

”اس بات پر بھی غور کرو مفضل! کہ جسم پر موجود بال بھی سب
جگہ یکساں نہیں ہیں۔ بعض مقامات کو بالوں سے مبراقرار دیا گیا ہے
اور اس میں اللہ کی بڑی نعمتیں اور انسان کے لیے بڑے فوائد ہیں۔

مثلاً دیکھو! یہ بال اگر آنکھوں کے اندر بھی نکلا کرتے تو کیا
انسان اندھانہ ہو جاتا۔ جس طرح کے بال داڑھی یا سر پر اُگتے
ہیں اسی طرح کے بال اگر منہ میں بھی نکلتے تو کھانے پینے کی
لذت ہی ختم ہو جاتی۔ نہ غذا کا ذائقہ پتا چلتا، نہ لقمه حلق تک
پہنچتا، نہ پانی کا گھونٹ آسانی سے منہ میں جاتا۔“

ہاتھوں کی جلد اور بال

”تم اپنے ہاتھوں کو دیکھو۔ ہاتھوں کے اوپر (کسی اور طرح کی
جلد ہے جس پر) بال موجود ہیں۔ ہتھیلوں کی طرف سے ہاتھوں کو
دیکھو تو یہاں (اور طرح کی جلد ہے) یہاں بال یا روئیں کا نام و
نشان تک نہیں ہے۔ اگر ہتھیلوں پر بھی بال ہوتے تو انسان کی
قوتِ لامسہ متاثر نہ ہوتی۔ انسان ہاتھوں ہی کے ذریعے کسی شے
کی نرمی، سختی (درجہ حرارت) وغیرہ کو محسوس کرتے ہیں۔ اگر یہاں
بال ہوتے تو انسان کسی شے کو چھو کر اس کے بارے میں کس

طرح معلوم کر سکتے تھے؟“

بعض مقامات بالوں سے خالی ہیں

”اسی طرح کئی اور مقامات ہیں جہاں بال ہوتے تو انسان بہت سی لذتوں اور راحتوں سے محروم ہو جاتا اور اپنے مقاصد حیات میں سے بعض کو حاصل کرنے میں ناکام رہتا۔“ (مفہوم) تو مفضل دیکھو! کیا بے شعور مادے اور علم، عقل، ارادے اور قدرت سے محروم طبیعت (نجپر) ان تمام مصلحتوں کی (پیشگی) منصوبہ بندی کر سکتی تھی، ان حکمتوں اور ضرورتوں کو سمجھ سکتی تھی کہ انسان کو کب کہاں کس چیز کی ضرورت پڑے گی۔ اس طرح کے حکیمانہ کاموں کو کیا کوئی عقل رکھنے والا شخص مادے یا طبیعت کی طرف منسوب کر سکتا ہے؟

دوسرے ذی حیات میں بھی ایسا ہی ہے

مفضل! یہ جو میں نے بالوں کے مقامات کے حوالے سے تمہیں بتایا تو یہ صرف انسانوں ہی سے مخصوص نہیں ہے۔ چوپاپیوں، درندوں اور پرندوں میں بھی تم ایسا ہی پاؤ گے اگرچہ ان کے جسم بالوں یا پروں سے ڈھکے ہوتے ہیں لیکن وہ مقامات جہاں بالوں کا ہونا انہیں ان کی غرضِ خلقت میں سے ایک بے حد اہم غرض و غایت سے روکتا، وہاں بال پیدا نہیں کئے

گئے۔ انسانوں یا دوسرے ذی حیات میں اپنی نسلوں کو آگے بڑھانا، ان کی غرضِ خلقت میں سے ایک انتہائی اہم غرض، ایک انتہائی ضروری مقصد ہے۔“

بدن سے متعلق مشقت

”اور مفضل! تم نے کہا تھا کہ اگر بال اور ناخن نہ بڑھا کرتے اور نہ کٹوانا پڑتے تو کیا تھا؟ تو اس میں ایک حکمت، مصلحت یہ بھی ہے کہ جہاں آدمی کو اپنے بدن سے متعلق کچھ مشقت اٹھانا پڑتی ہے، ان مشقتوں میں سے ایک یہ بھی قرار دی گئی ہے۔ اس لیے کہ جتنی دیر وہ اپنے بدن کی صفائی اور بالوں کے دور کرنے میں مصروف رہے گا، اتنی دیر اپنے حرص و ظلم، غرور و تکبیر اور ظلم سے بچا رہے گا۔“

نوٹ: بال جسم کے بیرونی حصوں پر ہوتے ہیں

بال ہمارے سارے جسم پر پائے جاتے ہیں لیکن سر، داڑھی اور چند دوسرے مقامات کے علاوہ یہ بال سارے جسم پر باریک روئیں کی شکل میں ہوتے ہیں اور جلد کے ہم رنگ ہوتے ہیں۔ خواتین کے یہاں یہ رواں جلد کے ہم رنگ، بہت باریک اور نادیدہ ہوتا ہے۔ (بعض افراد میں اس کے برعکس بھی ہوتا ہے) انسانی جسم پر ان بالوں کی تعداد تیس لاکھ سے زیادہ ہوتی ہے۔ ہر بال کے گرد بہت چھوٹے پٹھے ہوتے ہیں۔ جو ان بالوں کی حرکات کو کنٹرول کرتے ہیں۔

مرد اور عورت دونوں ہی انسان ہیں لیکن مردوں کے داڑھی نکلتی ہے اور خواتین کے چہرے پر داڑھی کا نام و نشان بھی نہیں ہوتا۔ تو سوال یہ ہے کہ مرد و عورت میں یہ الگ الگ طرح کے

انتظامات کس طرح ممکن ہوئے؟ کیا ایک بے شعور ماڈے میں یہ صلاحیت ہو سکتی ہے کہ وہ مردوں عورت کے پیدا ہونے سے پہلے ان کی ضروریات کو جانتا ہو اور پھر اسی کے مطابق مردوں میں الگ طرح کے بال پیدا کرنے کے انتظامات کرے اور خواتین میں دوسری طرح کے بال پیدا کرنے کا اہتمام کرے؟ پھر یہ ماڈہ جو خود ابھی وجود ہی میں نہیں آیا تھا، اس کے لیے یہ حیران کن انتظامات کرنا تو کجا، اس میں زمین پر گھاس کا تنکا اگانے کی بھی صلاحیت ہو سکتی ہے؟
 یہ سب احتمانہ باتیں ہیں۔ آج سائنس ان سب احتمانہ خیالات کے خلاف ہر روز نت نئے دلائل پیش کر رہی ہے۔ اثبات وجودِ خدا کے ایسے ثبوت پیش کرنا اور کسی کو سمجھانا شاید گزشتہ ادوار میں اتنا آسان نہیں تھا۔

دل کو سینے میں کیوں رکھا گیا؟

امام علیہ السلام نے فرمایا:

”کیا تم نے غور کیا کہ دل کو سینے میں کیوں رکھا گیا اور کس نے اسے وہ چادر اڑھائی جسے تم جھلّی کہتے ہو اور کس نے اس کی حفاظت کے لیے اسے ایسی جگہ رکھا جو پسلیوں کی ہڈیوں کے حفاظتی حصاء میں ہے۔ کس نے گوشت اور پٹھوں کے ذریعے اس کی حفاظت کی جو اس کے اوپر ہیں تاکہ اس تک کوئی ایسی چیز نہ پہنچ جو اس میں خراش ڈال دے۔“

نوٹ: دل اور میڈیکل سائنس

دل ہمارے سینے کی مضبوط ہڈیوں اور پسلیوں کے درمیان ہوا کے ذخیروں یعنی پھیپڑوں کے درمیان مخصوص قسم کی جھلی کی پٹیوں کی مدد سے لٹکا ہوا ہے۔ اس کے عقب میں ریڑھ کی ہڈی ہے اور اس کے قریب ہی ہمارا جگر موجود ہے۔

دل کا سائز تقریباً ہر انسان کی مٹھی کے برابر ہوتا ہے۔ اس کے اندر چار چیمپریز ہوتے ہیں اور یہ کسی پسپنگ مشین کی طرح چوبیں گھنٹے خون کو جسم کے اندر پمپ کرتا رہتا ہے۔

دل کے نصف بالائی حصے میں جسم کا استعمال شدہ گندہ خون آکر جمع ہوتا ہے اور اسی سمت کے دوسرے چیمپر میں چلا جاتا ہے۔ دل کا یہ چیمپر اس گندے خون کو فوراً ہی قریب موجود پھیپڑوں کی طرف روانہ کر دیتا ہے۔ پھیپڑے اس خون کے اندر موجود ہر میلے مادے، کاربن ڈائی آکسائیڈ کو اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں اور سانس نکالنے کے دوران یہ زہر میلی گیس

پھیپھڑوں سے خارج ہو جاتی ہے اور اسی دوران تازہ آکسیجن خون کے سرخ خلیوں میں بھر جاتی ہے۔ پھر یہ خون دل کے نچلے بائیں چمپر میں آتا ہے۔ اس چمپر کا نچلا حصہ اس خون کو دوبارہ جسم کی جانب پمپ کر دیتا ہے۔

بہ ظاہر یہ ایک سادہ سا عمل ہے لیکن ہماری زندگی کے لیے دل یہ خدمت ایک منٹ میں او سطھ 72 مرتبہ، ایک گھنٹے میں 4320 مرتبہ اور ایک دن میں 103680 مرتبہ سرانجام دیتا ہے۔ ایک لاکھ تین ہزار چھ سو اسی کے اس عدد کو اگر آپ اپنی زندگی کے آج تک کے دن کے عدد سے ضرب دیں تو حاصل ضرب حیران کن ہی نہیں ناقابل شمار بھی ہو گا اور آپ خود کو اللہ کے احسانات کا شمار کرنے میں بالکل بے بس اور مجبور محسوس کریں گے۔ لیکن اگر آپ نے اپنی بے بسی کو محسوس کر لیا تو شاید یہی احساس شکرِ نعمت بن جائے۔

آپ یہ سن کر بھی حیران ہوں گے کہ اگر اس وقت آپ کی عمر 45 سال کے قریب ہے تو آپ کا دل اب تک آپ کے جسم میں کم و بیش تین لاکھن خون پمپ کر چکا ہے۔

یوں تو جسم کا سارا خون ہی دل میں سے گزرتا ہے اور سارے جسم کو غذائی اجزاء فراہم کرتا ہے لیکن خود دل کو بھی غذا درکار ہوتی ہے اور یہ غذا دو شریانوں (Arteries) کے ذریعے دل کو فراہم ہوتی ہے۔ یہ شریانیں کورونری آرٹریز (Coronary Arteries) کہلاتی ہیں اور دیوار پر چپک کر چڑھنے والی بیل کی شاخوں کی طرح دل کے دائیں اور بائیں سمت چیلکی ہوئی ہوتی ہیں۔ ان دو شریانوں سے مزید چھوٹی شریانیں منسلک ہوتی ہیں اور پورے دل کے اوپر پھیلی ہوتی ہیں انہی کے ذریعے دل کو غذا کی فراہمی کی جاتی ہے۔

دل سے خون اسی وقت جسم کی طرف روانہ ہوتا ہے جب دل کے گرد موجود پٹھے اسے دباتے ہیں۔ دل سکڑتا ہے تو خون اس سے نکل کر جسم کی طرف سفر کرنا شروع کر دیتا ہے اور جسم کے ایک ایک حصے، عضو اور ایک ایک خلیے کو اس کی مطلوبہ خوراک پہنچانا شروع کر دیتا ہے۔

(حوالہ: جسم کے عجائب)

آواز کا سوراخ

امام علیہ السلام نے مفضل سے فرمایا:

”اور مفضل دیکھو کہ آواز کے سوراخ پر کس نے ایک ڈھکنا ڈھانکا جو غذا یا پانی کو پھیپھڑوں تک پہنچنے سے روکتا ہے۔ اگر غذا یا پانی پھیپھڑوں میں چلا جائے تو انسان کی موت واقع ہو سکتی ہے۔“

نوت: حلق کا نظام

امام کے اس حیران کن انکشاف کی تشرع ہم گز شستہ صفحات پر بیان کر چکے ہیں لیکن یہاں مختصرًا آپ کو بتادیں کہ ہمارے حلق کے اندر پائپ نمادونالیاں ایک دوسرے کے قریب موجود ہیں۔ ایسو فیگس (Esophagus) نامی نالی کے ذریعے غذا اور پانی ہمارے معدے میں جاتا ہے۔ سانس کی نالی کو ٹریچیا (Trachea) کہا جاتا ہے۔ جب آپ کوئی چیز نگلتے ہیں، مثلاً غذا کا نوالہ، پانی کا گھونٹ یا العابِ دہن تو آپ کے گردن کے درمیان ایک ہڈی ابھرتی نظر آتی ہے۔ جب یہ ہڈی اوپر اٹھے تو اس کا مطلب ہے کہ ایک مخصوص ڈھکن نے سانس کی نالی کو ڈھک دیا ہے تاکہ غذا یا پانی سانس کی نالی میں نہ چلا جائے۔ اس ڈھکن کو سائنسی زبان میں اپی گلوٹس (Epiglottis) کہا جاتا ہے۔ امام نے سانس کی نالی کو ڈھکنے والے اسی عضو کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

اگر پھیپھڑے کام کرنا بند کر دیں

اس کے بعد امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

”مفضل! ذرا دیکھو تو کہ یہ کس نے پھیپھڑوں کو دل کا پنکھا بنا�ا کہ یہ تھلتا ہی نہیں اور نہ کبھی اپنے کام سے روکتا ہے۔ اگر پھیپھڑے ذرا دیر کو بھی کام کرنا بند کر دیں تو انسان کی موت واقع ہو جائے۔“

نوٹ: دل اور پھیپھڑوں کا رشتہ

اوپر کی سطور میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ دل گندے خون کو پھیپھڑوں میں پمپ کرتا ہے۔ پھیپھڑوں کے اندر ایک پیچیدہ نظام موجود ہے۔ آئیے ایک سرسری سی نظر اس نظام پر ڈالتے ہیں تاکہ ہم امام علیہ السلام کے اس مختصر کلام کی عظمت کو کسی قدر سمجھ سکیں!

آپ کے سینے کے اندر تین سیکشن یا کمپارٹمنٹ ہیں۔ یہ تینوں حصے ایک دوسرے کے قریب لیکن الگ الگ اور سیل بند ہیں۔ ان میں سے دو خانوں میں ہمارے پھیپھڑے کام کرتے ہیں اور درمیانی خانے یا کمپارٹمنٹ میں ہمارا دل خدمات سر انجام دیتا ہے۔

آپ کے سانس لینے کی نالی جس کا سائز چار انچ ہے نیچے جا کر دو شاخوں میں بٹ جاتی ہے۔ ان شاخوں کو برانیکل ٹیوبس (Bronichial Tubes) کہا جاتا ہے اور یہ دونوں شاخیں دائیں اور باعین میں پھیپھڑے میں داخل ہو جاتی ہیں۔ پھیپھڑے کے اندر آنے کے بعد یہ دونوں شاخیں بے شمار چھوٹی شاخوں میں تقسیم ہوتی چلی جاتی ہیں اور آخری مرحلے میں یہ ہماری حد بصارت سے بالاتر ہو جاتی ہیں۔

خون کے سرخ خلیوں سے کاربن ڈائی آکسائیڈ کیس کو نکال کر ان میں تازہ آکسیجن بھرنے کا کام اسی مرحلے میں سر انجام پاتا ہے۔

حد بصارت سے بالاتر یہ نالیاں جن کی چوڑائی ایک انچ کے سو ویں حصے کے برابر ہوتی ہے، پھیپھڑوں میں موجود ہوا کی تھیلیوں پر چمکی ہوئی ہوتی ہیں۔ ہوا کی ان تھیلیوں کی شکل انگور جیسی ہوتی ہے اور یہ صرف خرد بین ہی سے نظر آ سکتی ہیں۔ ہوا کی ان تھیلیوں کو ایل ویولائی (Alveoli) کہا جاتا ہے۔

دل سے آنے والا گند اخون جب یہاں سے گزرتا ہے تو خون کے سرخ خلیوں کو ان باریک ترین نالیوں سے گزرنے کے لیے کیو (Que) بنانا پڑتا ہے۔ یعنی خون کے خلیے ان نالیوں میں سے لائن بنایا کر ایک ایک کر کے گزرتے ہیں۔ اس مرحلے پر سرخ خلیوں میں موجود کاربن ڈائی اکسیجن پر 167

دل کو سینے میں کیوں رکھا گیا؟

آکسائیڈ (زہر ملی گیس) خون کی باریک ترین نالیوں کے نچلے حصے میں جذب ہو جاتی ہے اور ہوا کی تھیلیوں (Alveolies) کے اندر موجود تازہ آکسیجن خلیوں کے اوپری حصے میں جذب ہوتی جاتی ہے۔ تازہ آکسیجن کے بھرتے ہی خون کے یہ سرخ خلیے واپس دل کی طرف آتے ہیں جہاں سے اس تازہ زندگی بخش خون کو دوسری ضروریات زندگی کے ساتھ دوبارہ جسم کی طرف روانہ کر دیا جاتا ہے۔

شاید یہی سبب ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے پھیپھڑوں کو دل کا پنکھا کہا ہے اور یہ بھی فرمایا کہ یہ کبھی تحکما نہیں۔ اس کا مطلب بھی واضح ہے کہ پھیپھڑے انسان کے پیدا ہونے کے پہلے لمح سے اپنا کام کرنا شروع کرتے ہیں اور آخری سانس تک اس کے لیے بلا تعطل، بلا معاوضہ یہ خدمات سرانجام دیتے رہتے ہیں۔ (حوالہ: جسم کے عجائب)

سوراخ اور ڈوریاں

امام علیہ السلام نے مفضل ابن عمر سے فرمایا:

”تم نے کبھی غور کیا کہ یہ کس نے پیشتاب اور فضلے کو جسم سے خارج کرنے والے سوراخوں میں الیسی ڈوریاں لگائیں جو ان دونوں کوروں کے اور سمیئے رکھتی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ گندے مادے بہتے ہی رہا کرتے اور انسان کی زندگی انتہائی تلخ اور ناگوار ہو جاتی۔“

نوٹ: نکاسی کا نظام

امام علیہ السلام نے جسم سے فاضل اور گندے مادوں کے خارج ہونے کے جس نظام کی طرف اشارہ فرمایا اور جن ”ڈوریوں“ کا ذکر کیا وہ حیران کن باتیں ہیں۔ امام علیہ السلام کے دور

سے صدیوں پہلے اور صدیوں بعد تک کسی کو بھی جتنی طور پر یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ نظام کس طرح کام کرتا ہے۔ یہ قیمتی معلومات ماہرین حیاتیات کو 19 ویں صدی عیسوی میں معلوم ہونا شروع ہوئیں۔ آئیے اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے اس نظام کو فزیالوجی کی مدد سے کسی قدر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہم جب کوئی غذا استعمال کرتے ہیں تو وہ معدے میں جا کر قابل ہضم بنتی ہے اور پیٹ کی سی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ معدہ اس پیٹ کو چھوٹی آنت کی طرف روانہ کرتا ہے اس وقت یہ تیزابی مادوں سے بھری ہوتی ہے۔ اسی لیے چھوٹی آنت ایک رطوبت پیدا کرنے لگتی ہے۔ یہ رطوبت پلک جھپکنے کی سی مدت میں آپ کے لبلے (Pancreas) تک پہنچتی ہے۔ اس کے رد عمل میں لبلہ ایک نمکین رطوبت پیدا کرنے لگتا ہے اور یہ نمکین رطوبت چھوٹی آنت میں آکر گرنے لگتی ہے اور تیزابی اثرات کو بے اثر کر دیتی ہے۔

اسی دوران صfra (Bile) جگر سے تیار ہو کر یہاں آتا ہے اور چکنائی یا چربی کے بڑے ذرات کو چھوٹے ذرات میں تبدیل کر دیتا ہے۔

چھوٹی آنت کے بعد آنت کے دوسرے حصے ہیں اور ہر حصہ غذا پر اپنا اپنا کام کرتا ہے۔ بڑی آنت اس گاڑھے سیال سے تمام پانی نکال کر اسے دورانِ خون میں واپس کر دیتی ہے۔ اسی دورانِ غذا میں موجود تمام غذائی اجزاء بھی دورانِ خون میں شامل ہو جاتے ہیں۔

فاضل مادے، آنتوں میں موجود بیکٹر یا اور غذا کے ناقابل ہضم اجزاء پر مشتمل ہوتے ہیں وہ نسبتاً سخت حالت میں بڑی آنت کے آخری حصے ریکٹم سے ذرا پہلے ایک مقام پر اسٹور ہو جاتے ہیں اور وقت مقررہ پر انسان کی خواہش اور ارادے کے مطابق جسم سے باہر نکل جاتے ہیں۔

اگر انسان پیٹ کی کسی بیماری میں بتلا ہو تو فاضل مادوں کے اسٹور کرنے اور مناسب وقت پر انھیں خارج کرنے کی یہ سہولت عارضی طور پر معطل ہو جاتی ہے۔ اس پر انسان کا کنٹرول نہیں رہتا۔ اس کے علاوہ جسم سے خارج ہونے والے زہر یا فاسد مادوں میں مقدار کے لحاظ سے

سب سے زیادہ اور سب سے زہریلا مادہ پیشتاب کی صورت میں جسم سے خارج ہوتا ہے۔ عام طور پر لوگ سوچتے ہیں کہ ہم جو پانی پیتے ہیں وہ پیشتاب بن کر جسم سے نکل جاتا ہے۔ لیکن بات اتنی سادہ نہیں ہے۔ اس پانی کو جسم کا ایک ایک خلیہ استعمال کرتا ہے جس کے سبب یہ پانی زہریلا ہو جاتا ہے اور یہ زہریلے مادے ایک انتہائی پیچیدہ نظام سے گزر کے جسم سے خارج ہو جاتے ہیں۔

ہمارے جسم میں ہر وقت تقریباً ساڑھے چار لیٹر خون موجود رہتا ہے اور مسلسل سفر میں رہتا ہے۔ ہمارے گردے اس خون کو بار بار صاف کرتے رہتے ہیں۔ یہ خون چوبیس گھنٹوں میں 48 مرتبہ ہمارے گردوں میں صفائی کے لیے آتا ہے۔ ہر مرتبہ اس کے اندر زندگی کے لیے ضروری اجزاء کے ساتھ ساتھ بے شمار زہریلے مادے بھی موجود ہوتے ہیں۔ مثلاً ضرورت سے زیادہ نمک اور پوٹیشیم جوغدا کے ذریعے جسم میں آتے ہیں۔

اگر فاسد مادے جسم سے خارج نہ ہوں

اضافی نمک جسم سے خارج نہ ہو تو پیٹ اور پاؤں پھولنے لگیں گے اور دل پر بوجھ بڑھ جائے گا۔ پوٹیشیم کی مقدار جسم میں کم ہو تو پڑھے کمزور پڑ جائیں گے اور سانس لینا مشکل ہو جائے گا۔ اس کی مقدار ضرورت سے زیادہ ہو جائے تو دل کی دھڑکنیں بے قابو ہو جائیں گی۔

ہمارے گردے ان دونوں کی مقدار پر نظر رکھتے ہیں اور اضافی نمک یا پوٹیشیم کو دورانِ خون سے نکال کر اسے ہمارے مثانے کی طرف روانہ کرتے رہتے ہیں۔

جسم کا سب سے زیادہ اور مہلک فصلہ یوریا (Urea) ہوتا ہے۔ یہ زہریلا مادہ پروٹین یعنی گوشت کے ہضم ہونے کے دوران پیدا ہوتا ہے۔ جسم میں اس کی کمی جگر میں کسی خرابی کی نشاندہی کرتی ہے اور اس کی زیادتی ایک انتہائی خطرناک بیماری ”یوری مک پوازنگ“ کا سبب بن جاتی ہے۔ اس سے مریض گہری غنوڈگی میں جاسکتا ہے۔ جب گردے اسے نکالنے میں ناکام ہو جاتے ہیں تو یہ فاسد مادہ پینے کے مسامات سے نکلنے لگتا ہے۔

اسی لیے ہمارے گردے ہر وقت ان سارے ماؤں پر نظر رکھتے ہیں اور اضافی ماؤں کو تھوڑا تھوڑا کر کے دو ٹیوبس (Ureters) کے ذریعے اپنے نیچے موجود مثانے میں گراتے رہتے ہیں۔ یہ پیشاب مثانے میں اسٹور ہوتا رہتا ہے۔

مثانے کے اندر اللہ نے دو والو بنائے ہیں۔ ان دونوں والوؤں کو اسفنکٹرز (Sphincters) کہا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک مثانے کے اوپر والے حصے میں ہوتا ہے۔ جب مثانہ پیشاب سے بھر جاتا ہے تو یہ والوکھل جاتا ہے۔

دوسراؤ والوں کے نیچے ہوتا ہے اور اسے کھولنا آپ کے اختیار میں ہوتا ہے۔ جب پہلا والو کھلتا ہے تو آپ کو پیشاب کی حاجت محسوس ہوتی ہے لیکن آپ چاہیں تو پیشاب کچھ دیر کے لیے روک سکتے ہیں کیوں کہ مثانے کا دوسراؤ والو کھولنا آپ کے اختیار میں ہوتا ہے۔ آپ مناسب جگہ مقام و موقع دیکھ کر اس زہر لیے ماؤں کے کو جسم سے باہر نکال سکتے ہیں۔

یہ ہیں وہ سوراخ اور انھیں کھولنے اور بند کرنے والی نادیدہ ڈوریاں جو وقت ضرورت کھلتی اور بند ہوتی ہیں اور جن کی طرف امام جعفر صادق علیہ السلام نے ساتویں صدی عیسوی میں انسانوں کو متوجہ فرمایا اور جن کے بارے میں امامؐ کے عہد سے صدیوں پہلے اور صدیوں بعد بھی کوئی انسان تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ قدرت کے ان انتظامات کے بارے میں جانتا تو بہت دور کی بات ہے۔

فانج یاد ماغی امراض کی صورت میں پیشاب کو روکنا ممکن نہیں رہتا۔ جتنا پیشاب بتا رہتا ہے اتنا ہی ہر وقت جسم سے نکلتا رہتا ہے۔ اسپتا لوں میں آپ نے اکثر مریضوں کے بیڈ کے ساتھ پیشاب کی تھیلیاں لٹکی دیکھی ہوں گی، ان تھیلیوں میں پلاسٹک ٹیوبس ہوتی ہیں جنہیں براہ راست مریض کے مثانے سے مسلک کیا گیا ہوتا ہے۔ (حوالہ: جسم کے عجائب)

جسم سے فاضل ماؤں کا مناسب وقت پر اخراج اور ان پر انسان کا کنٹرول ہونا اللہ تعالیٰ کی کس قدر عظیم نعمت اور اس کی صنعت و حکمت کا کس قدر عظیم نمونہ ہے۔ لیکن انسان اللہ تعالیٰ کے

ان احسانات کو اس وقت تک محسوس نہیں کرتا جب تک ان میں کوئی خرابی یا خلل پیدا نہ ہو جائے۔

جو نہیں جانتے وہ زیادہ ہیں

امام علیہ السلام نے اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے آخر میں فرمایا:

”مفضل! یہ ماذے اگر بہتے ہی رہا کرتے تو انسان کی زندگی کس قدر تلخ اور ناگوار ہو جاتی! اسی طرح آدمی غور کرتا جائے تو بہت سی باتیں ہیں جنہیں شمار کرنے والا شمار کر سکتا ہے لیکن اللہ کے جن احسانات اور حکمتوں کو شمار نہیں کیا جا سکتا اور جنہیں انسان نہیں جانتے وہ ان سے کہیں زیادہ ہیں جنہیں وہ جانتے ہیں۔“

اعضاء کی موزوںیت

انگریزی زبان میں ایک لفظ استعمال ہوتا ہے، کومپیٹ اسبل (Comptiable)۔ کمپیوٹر کے کئی پروگراموں یا ہارڈ ویرز میں بھی اس لفظ کا استعمال عام ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ یہ پروگرام یا پارت فلاں کمپیوٹر میں چل سکتا ہے۔ فلاں میں کام نہیں کرے گا۔

چلیں آپ کو مزید سادہ سی مثال دیں مثلاً آپ از جی سیور بلب خریدتے ہیں تو دکاندار آپ سے معلوم کرتا ہے کہ چوڑی والا چاہیے یا دوسرا؟ آپ اسے بتاتے ہیں کہ چوڑی والا چاہیے کیونکہ آپ کو معلوم ہے آپ کے بلب ہولڈر میں چوڑیاں بنی ہوئی ہیں۔ اگر آپ غلطی سے دوسری قسم کا بلب خرید لیں گے تو وہ ہولڈر میں نہیں لگے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ جانتے ہیں کہ چوڑی والا بلب، ہی آپ کے بلب ہولڈر کے ساتھ Comptiable ہے۔

اسی طرح آپ کے پاس DVD ہے تو یہ DVD پلیسیر پر ہی چلے گی۔ اگر آپ اسے DVD پلیسیر کی بجائے ٹوٹر کے اندر ڈال دیں تو ظاہر ہے کہ یہ چونکہ ٹوٹر سے Comptiable نہیں ہے تو ٹوٹر سے جلا تو سکتا ہے چنانہیں سکتا۔

نوت: مرد اور عورت

انسانی جسم کے اعضاء اور مرد، خواتین کے الگ الگ اعضاء کو اللہ تعالیٰ نے اسی طرح ایک دوسرے کے لیے موزوں Comptiable بنایا ہے اور ان اعضاء کو سکڑنے اور پھینے والا، کھلنے اور بند ہونے والا تخلیق فرمایا ہے۔ بعض اعضاء کھلنے اور پھر بند ہو جانے والے پھولوں کی طرح ہیں اور بعض اعضاء شہد کی مکھی کی اسٹرا جیسی زبان کی طرح ہیں۔ شہد کی مکھی کی اسٹرا جیسی یہ زبان عام حالت میں اس کے منہ میں بند رہتی ہے لیکن وقتِ ضرورت یہ سیدھی ہو کر تن جاتی ہے۔ کام ختم

ہونے کے بعد یہ سمجھ کر واپس شہد کی مکھی کے منہ میں چلی جاتی ہے۔

شریعت اور سائنس کی زبان

نوٹ: اس موضوع پر امام جعفر صادق علیہ السلام کے ارشادات کو ہم نے مقابہت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان اعضاء میں قدرت کی نشانیاں اور ان کی کارکردگی جاننا چاہیں تو ہماری کتاب ”جسم کے عجائب“ کا مطالعہ فرمائیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ شریعت اور سائنس کی زبان بہت واضح اور دلوك ہوتی ہے تا کہ کسی حکم اور اصول کو سمجھنے میں کوئی ابہام پیدا نہ ہو لیکن عام قارئین کے لیے کتاب لکھتے وقت اس بات کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے کہ کوئی لفظ قاری کے ذوق مطالعہ پر گراں نہ گز رے۔ امام علیہ السلام نے اعضاء کے تولید کے حوالے سے جو کچھ فرمایا، اسے ہمارے قارئین تو حید الاممہ یا توحید مفضل نامی کتاب میں ملاحظہ فرماسکتے ہیں۔

اس کے بعد امام جعفر صادق علیہ السلام نے اثباتِ وجودِ خدا کے حوالے سے دلائل دیتے ہوئے مفضل ابن عمرؓ کو ان اعضاء کی خلقت اور کارکردگی کے بارے میں بھی بتایا جو ہمارے جسم سے زہر لیلے اور فاسد مادوں کو باہر نکالنے کے ذمے دار ہیں۔

جسم کا ڈرینج سسٹم

امام علیہ السلام نے فرمایا:

”مفضل! ذرا اس بات پر بھی غور کرو کہ انسان کے کھانے پینے سے (جو زہر لیلے مادے جسم میں پیدا ہوتے ہیں) ان کا جسم سے نکل جانا (انسان کے لیے) اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی نعمت ہے۔

دیکھو مفضل! جب کوئی گھر تعمیر کیا جاتا ہے تو اس میں بیت الحلاء (ٹوائیٹ) ایک خاص مقام پر بنایا جاتا ہے۔ (جہاں پر دہ بھی

ہوا اور جس جگہ سے غلطیں بہ آسانی گھر سے باہر نکل سکیں۔)

اسی طرح جسم کے (فاسد اور زہریلے، بدبودار) فاضل مادوں کو جسم سے باہر نکالنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کے جسم میں نکائی کی جگہ ہیں ایسے مقامات پر بنائی ہیں جو بہت پوشیدہ ہیں۔ اخراج کی جگہ ہیں ایسے مقام پر نہیں بنائیں جو ہر وقت نظر آتی ہوں۔“

فتبارک اللہ من تظاهرت الائمه ولا تحصى نعمائہ
تو مفضل! دیکھو کہ کیا مادے یا طبیعت میں یہ شعور ہو سکتا ہے
کہ ہر عضو کو انسان کی سہولت کے مطابق ایک خاص مقام پر خلق
کر سکے۔“

بدن کی چار قوتیں

امام علیہ السلام نے فرمایا:

”اب میں تم سے ان چار قوتوں کا بیان کروں گا جو انسانی جسم کو عطا کی گئی ہیں (اور جسم کے مختلف اعضاء کی مدد سے کام کرتی ہیں یا مختلف اعضاء ان کی مدد سے کام کرتے ہیں)

۱۔ قوتِ جاذبہ: یہ قوت غذا کو جسم کے لیے قابلِ قبول بناتی ہے اور اسے معدے میں لے جاتی ہے۔

۲۔ قوتِ ماسکہ: یہ وہ قوت ہے جو غذا کو جسم میں روکتی

ہے تاکہ طبیعت (اللہ کی قدرت) اس غذا پر کام کر سکے۔ یہ قوت غذا کو جسم میں ٹھہراتی ہے۔ ورنہ غذا اور پانی استعمال کرتے ہی جسم سے باہر نکل جایا کرتا۔

۳۔ قوتِ هاضمہ: یہ قوت غذا کو پکانی ہے۔ قبل ہضم بناتی ہے اور اس کا لب بیباپ یا جوہر نکال کر اسے (دورانِ خون کے ذریعے) بدن میں پھیلا دیتی ہے۔ (اس کی مثال آن توں کا غذا سے سارا پانی نکال کر غذائی اجزاء کو واپس خون میں شامل کر دینا ہے۔ اسی طرح چکنائی کا ایک دوسرے نظام کے تحت جسم میں پہنچنا ہے جس کی تفصیل آپ گز شۂ ابواب میں پڑھ چکے ہیں۔)

۴۔ قوتِ دافعہ: یہ وہ قوت ہے وہ جو غذا سے جوہر حیات نکلنے کے بعد فاضل مادوں کو جسم سے دفع (خارج) کر دیتی ہے۔

”تو مفضل! انسان کو اپنے جسم میں موجود ان قوتوں پر غور کرنا چاہیے کہ انہیں کس نے بنایا اور کس حسن و خوبی کے ساتھ بنایا۔ انہیں اس لیے بنایا گیا کہ جسم کو ان کی ضرورت تھی۔ تم ان پر جس قدر غور کرو گے تو تمہیں ان میں خالق کائنات کی (اسی قدر زیادہ) حیران کن تدبیریں اور حکمتیں نظر آئیں گی۔“

بادشاہ اور خدمت گار

امام علیہ السلام نے فرمایا:

”میں تم سے ایک مثال بیان کرتا ہوں۔ دیکھو! مثلًا انسان کا جسم تو ایک بادشاہ کا مکان ہے۔ اس مکان میں اس کے بچے اور اس کے خاص خدمت گار رہتے ہیں۔ اسی مکان میں کئی نوکر چاکر بھی ہیں جو اس مکان کے سارے کاموں کو سرانجام دینے کے ذمے دار ہیں۔

(۱) مثلًا ایک نوکر کا کام ہے کہ وہ ضروری چیزوں کو جمع کرے اور ان خاص خدمت گاروں کے پاس رکھے۔

(۲) دوسرے کا کام یہ ہے کہ جو کچھ آیا ہے اس کو لے جائے اور جمع کرے تاکہ ان چیزوں کی اصلاح ہو سکے اور انہیں کھانے کے لاٹ بنایا جاسکے۔

(۳) تیسرا نوکر کا کام یہ ہے کہ وہ اسے درست کرے، کھانے کے لیے تیار کرے اور ہر ایک کو تقسیم کرے۔

(۴) چوتھے ملازم کی ذمے داری ہے کہ گھر کی صفائی کا خیال رکھے اور گھر میں جو کوڑا کر کٹ جمع ہو گیا ہے اسے مکان سے جمع کر کے گھر سے دور کوڑے کے ڈھیر پر لے جا کر پھینک دے۔

اب دیکھو! ”اس مکان (جسم انسانی) کا مالک و بادشاہ تو

خلاق علیم ہے جو تمام عالموں کا مالک ہے اور مکان..... مکان یہ جسم ہے اور اس کے خاص خدمت گاریہ اعضاء ہیں اور نوکر چاکریا ملازم یہی چارقوتوں ہیں جن کا میں نے تم سے بیان کیا ہے۔“

(اور انسان اس مکان میں کرائے دار کی سی حیثیت سے رہتا ہے۔ البتہ اسے کوئی کراہیہ ادا نہیں کرنا پڑتا اور شاید اسی لیے بھول جاتا ہے کہ یہ مکان اس کا ذاتی مکان نہیں ہے۔ ایک دن اسے اس مکان کو خالی بھی کرنا ہے!)

میرا بیان اس طرح کا نہیں

”مفضل! تم شاید میری ان باتوں کو جو میں نے تمہیں بدن کی چارقوتوں کے بارے میں بتائی ہیں غیر ضروری یا بے سبب خیال کرو کیونکہ یہ عام سی باتیں ہیں جو طبیبوں اور حکیموں کو بھی معلوم ہیں لیکن میرا بیان اس طرح کا نہیں ہے اور نہ میری گفتگو کا مقصد وہ باتیں بتانا ہے جو اطباء کی کتابوں میں لکھی گئی ہیں اور جن کی انہیں بیماریوں کو دور کرنے یا علاج معا لجے کے لیے ضرورت پڑتی ہے۔ میں نے یہ باتیں اس مقصد کے لیے نہیں بتائیں۔ میں نے ان چارقوتوں کا بیان اس مقصد سے کیا ہے جس کی ضرورت دین کی اصلاح اور گمراہوں کو راہ دکھانے کے لیے پڑتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ سب کچھ خود بہ خود پیدا ہو گیا۔ اس کا پیدا کرنے والا کوئی نہیں۔“

اس کی مثال میرا وہ بیان اور مثال ہے جس میں میں نے
”تدبیر اور حکمت“ کو واضح کیا تھا۔

نوٹ: تدبیر سے کیا مراد ہے؟

اس عنوان کے تحت امام علیہ السلام نے انسان کی خلقت کے ابتدائی مراحل کو بیان کیا تھا اور بتایا تھا کہ حمل ٹھہر نے کے بعد ”تدبیر“ الہی ہوتی رہتی ہے۔ امام علیہ السلام کے اس جامع کلام کی مختصری وضاحت ہم گز شستہ ابواب میں جینیک سائنس کی مدد سے قارئین کی خدمت میں پیش کر چکے ہیں۔

حافظہ، نسیان اور شرم و حیا

امام علیہ السلام نے فرمایا:

”مفضل! ذر ان غور کرو ان صلاحیتوں کے بارے میں جنہیں
نفس انسانی میں رکھا گیا ہے۔ میرا مطلب ہے حافظہ، نسیان
(بھول جانا) اور شرم و حیا۔

دیکھو اگر ان میں سے صرف قوت حافظہ ہی انسان میں نہ ہو تو
اس کا کیا حال ہوگا۔ اس کے کاموں میں کس قدر خلل پیدا ہوگا۔ وہ
تجارت لین دین وغیرہ کس طرح کر سکے گا۔ اسے یاد ہی نہیں رہے گا
کہ اس کا دوسروں پر کیا آتا ہے، دوسروں کا اسے کیا دینا ہے۔

کب کس سے کیا لیا تھا، کیا دیا تھا، کیا سنا تھا، کیا وعدہ کیا
تھا؟ کس نے اس پر احسان کیا تھا اور کس نے اس کے ساتھ

برائی کی تھی۔ کس چیز نے اسے فائدہ پہنچایا تھا اور کس چیز نے
نقسان۔

پھر وہ اگر راستہ چلتا تو وہ راستہ اسے یاد ہی نہ رہتا، اگر
پڑھتا تو کسی علم کو یاد کس طرح رکھ پاتا۔ وہ نہ کسی دین کی
اچھائیاں یاد رکھ کر اس پر قائم رہ سکتا تھا۔ نہ کسی تجربے سے فائدہ
اٹھا سکتا تھا۔ نہ کسی گز شستہ چیز پر کسی موجودہ چیز کو قیاس کر سکتا تھا

کہ اسے پہلے کہاں دیکھا تھا اور یہ کیا ہے؟

تو دیکھو کہ صرف یہ ایک ہی صلاحیت کس قدر آنمول اور
ضروری ہے کہ اگر صرف یاد داشت نہ رہے تو زندگی کس قدر
بدمزہ ہو جائے گی۔ کس قدر دشواریاں اس کے کاموں میں حائل
ہو جائیں گی اور وہ زندگی سے تنگ آ جائے گا۔“

بھول جانا بھی ایک نعمت

امام علیہ السلام نے فرمایا:

”اور دیکھو! حافظے سے بھی بڑھ کر جو نعمت انسان کو ملی ہے
وہ ہے نسیان (یعنی بھول جانے کی صلاحیت) اگر نسیان نہ ہوتا تو
آدمی کو اپنی کسی مصیبت پر کبھی صبر و سکون، ہی نہ مل پاتا اور نہ کبھی وہ
اپنی محرومیوں پر صبر کر سکتا تھا۔ نہ اس کی کوئی خواہش کبھی دھیمی

پڑتی (مثلاً اسے اپنے گھر، کار، دولت یا کسی اور چیز کی خواہش ہوتی تو یہ خواہش کسی لمحے کم نہ ہوتی۔ کسی سے انتقام لینا ہوتا تو وہ ہر وقت اس آگ میں جلتا رہتا)

اس کے نتیجے میں وہ دنیا کی لذتوں سے فائدہ ہی نہ اٹھا پاتا
اس لیے کہ اسے اپنی مصیبتوں اور حسرتیں ہمیشہ یاد رہتیں۔ نہ اسے حکمرانوں کے بھول جانے اور حاسدوں کے حسد سے رکنے کی کوئی امید رہتی۔ (اسے ہر وقت یاد رہتا کہ میں نے فلاں غلط کام کیا تھا کسی وقت بھی پکڑا جاؤں گا) اسے یاد رہتا کہ فلاں غلطی میں نے کی تھی تو سزاد یعنی والا اسے بھولے گا نہیں۔ اسی طرح حسد کرنے والوں اور اس کے ساتھ زیادتی کرنے والوں کی باتیں وہ کسی لمحے بھول ہی نہ پاتا اور اس طرح اس کی زندگی تلخ ہو کر رہ جاتی۔“

متضاد لیکن مفید

”تو مفضل! کیا تم نہیں دیکھتے کہ یہ دونوں صلاحیتوں یعنی حافظہ اور نسیان جو ایک دوسرے کے متضاد ہیں کس طرح انسان میں پیدا کی گئی ہیں اور ان میں کس قدر مصلحتیں اور حکمتیں ہیں (جن سے ہر انسان فائدہ اٹھاتا ہے) حافظہ اور بھول دونوں ایک دوسرے کے برعکس ہیں لیکن تم دیکھو کہ دونوں ہی انسان کو کس طرح فائدہ پہنچاتی ہیں۔ دونوں میں انسان کے لیے فائدہ ہی

فائدہ ہے۔

اب دیکھو کہ پچھ لوگوں کا نظریہ و اعتقاد ہے کہ تمام اشیائے عالم کے دوالگ الگ خالق ہیں۔ ”(مانو یہ فرقے کے لوگوں کا اعتقاد ہے کہ سودمند چیزوں کو الگ خدا نے پیدا کیا اور نقصان دہ چیزوں کا خالق کوئی اور ہے)

کیا حافظہ اور نسیان، الگ الگ خداوں کی تخلیق ہیں؟

امام علیہ السلام نے فرمایا:

”نسیان یا بھول جانا بہ طاہر نقصان دہ چیز ہے اور حافظہ ایک سودمند صلاحیت ہے تو دوالگ الگ خداوں کو ماننے والے ان دونوں متضاد، ایک دوسرے کے برعکس صلاحیتوں کو اگر دو الگ الگ خداوں کی تخلیق سمجھیں تو یہ غلط ہو گا کیوں کہ دونوں ہی صلاحیتیں انسان کو فائدہ پہنچاتی ہیں۔ دونوں میں نفع ہی نفع ہے۔ دونوں میں کوئی نقصان نہیں ہے۔ شر پیدا کرنے والا

”خدا“، خیر پیدا ہی نہیں کر سکتا ہے جیسا کہ خود ان کا نظریہ ہے۔

تم یہ بھی دیکھو مفضل کہ حافظہ اور نسیان کس قدر عظیم الشان نعمتیں ہیں اور انہیں کس طرح انسان میں خلق کیا گیا۔“

(تو کیا کسی حکیم مطلق کے ارادے کے بغیر انسانی وجود میں ایسی صلاحیتیں پیدا ہو سکتی تھیں۔

ماڈہ یا نیچرا نسیان کی زندگی کے لیے ضروری ان باتوں کا خیال رکھ سکتے تھے؟)

نوت: حافظہ اور نسیان میڈیا کل سائنس کی نظر سے

انسان پیدا ہونے کے پہلے لمحے سے لے کر اپنے آخری سانس تک اپنے ارد گرد کے ماحول سے جو بھی معلومات حاصل کرتا ہے وہ اپنے پانچ حواسوں کے ذریعے حاصل کرتا ہے۔ ان پانچ حواسوں یا حاسوں (یعنی اعضاء) کا کام ارد گرد کے ماحول سے معلومات جمع کر کے انہیں دماغ کی طرف روانہ کرنا ہے۔

آنکھیں ارد گرد کی ہر چیز کو ہر وقت اسکین کرتی رہتی ہیں اور ان کی تصاویر برقی کیمیائی سگنلز کی شکل میں دماغ کو ارسال کرتی رہتی ہیں۔ کان، ارد گرد کی آوازوں کو جمع کر کے انہیں دماغ تک پہنچاتے ہیں۔ زبان ذاتیوں کی اطلاع دماغ کو فراہم کرتی ہے۔ ناک خوشبوؤں یا بدبوؤں کے بارے میں ہر لمحہ دماغ کو اطلاعات فراہم کرتی ہے۔

ہماری جلد میں موجود اعصابی نظام ارد گرد کے ماحول کے درجہ حرارت، روشنی، تاریکی، چیزوں کی نرمی اور سختی کے بارے میں دماغ کو اطلاع دیتا رہتا ہے۔ مثلاً جس بیڈ یا کرسی پر آپ بیٹھتے ہیں یا جس چیز کو آپ چھوڑ رہے ہیں وہ نرم ہے یا سخت، گرم ہے یا ٹھنڈی؟ آپ کے ارد گرد اندر ہر ایسا چیز کی تفصیلات ہر لمحے ہمارا اعصابی نظام دماغ کو فراہم کرتا ہے۔ یہی نظام جسم کی اندر ورنی ضرورتوں، دردوں اور تکلیفوں کے بارے میں بھی دماغ کو اطلاعات فراہم کرتا رہتا ہے۔

دماغ ہر لمحہ بیرونی دنیا سے اپنی طرف آنے والی لاکھوں معلومات کو برقی کیمیائی سگنلز کی شکل میں وصول کرتا ہے۔ پھر انہیں ”اپنی زبان“، میں تبدیل کر کے ڈی کوڈ کرتا ہے اور ضروری معلومات پر جسم کے اعضاء کو اس مخصوص صورتِ حال کے مدارک کے لیے فوری احکامات صادر کرتا ہے۔

مثلاً آپ کا پاؤں موزیک کے فرش پر پھسلنے لگتا ہے تو پاؤں میں موجود موافقی نظام اس کی فوری اطلاع دماغ کو فراہم کرتا ہے۔ اسی وقت آپ کے کانوں میں توازن کو برقرار رکھنے والا نظام دماغ کو اطلاع فراہم کرتا ہے کہ جسم (مثلاً) دائیں طرف گزرا ہے۔ دماغ فوراً ہی جسم کے باسیں

حصے کے پھوٹوں کو کھینچ جانے کا حکم صادر کرتا ہے اور یہ پڑھے جسم کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں اس طرح آپ گرتے گرتے سنبھل جاتے ہیں۔ اگر خدا نہ خواستہ کوئی شخص بے اختیار منہ کے بل سامنے کی طرف گر جائے تو بھی دماغ ہاتھوں کو حکم دیتا ہے اور ہاتھ، چہرے سے پہلے زمین پر ٹک جاتے ہیں اور چہرہ زخمی ہونے سے محفوظ رہتا ہے۔

آپ کے فرش پر پھسلنے کی تمام تفصیلات کو دماغ اپنے پاس محفوظ کر لیتا ہے اور آئندہ جب آپ موزیک کے فرش پر قدم رکھتے ہیں تو دماغ آپ کو گزشتہ تجربے کی تمام تفصیلات سے آگاہ کر دیتا ہے اور اب آپ احتیاط سے قدم اٹھاتے ہیں۔

اسی طرح جب آپ کوازان کی آواز آتی ہے تو دماغ آپ کو نماز کے بارے میں یاد دلاتا ہے اور آپ مسجد کا رخ کرتے ہیں اور جب آپ چلتے چلتے فائرنگ کی آواز سنتے ہیں تو جھک جاتے ہیں اور چھپنے کی جگہ تلاش کرنے لگتے ہیں۔

آپ کسی دوست، شمن، کسی رشتے، کسی شئے، کسی دوا، غذا، مشروب کو دیکھیں یا اس کا نام سنیں تو دماغ ان سے متعلق تمام تفصیلات اور تجربات آپ کو یاد دلادیتا ہے۔ اگر یہ یادداشت اور حافظہ نہ ہوتا تو مشکلات کا اندازہ آپ خود کر سکتے ہیں۔

اس سے حیران کن معاملہ نسیان کا ہے

دماغ کے اندر یہ صلاحیت بھی موجود ہے کہ وہ آپ کے لیے انتہائی ضروری، ضروری، غیر ضروری اور غیر اہم معلومات کو الگ الگ استھور کر سکے۔ انتہائی ضروری معلومات اور ضروری معلومات ذہن میں ہر وقت تازہ رہتی ہیں۔ غیر ضروری، غیر اہم، تکلیف وہ یادوں، باتوں اور تجربات کو دماغ بترنج آپ کی فوری پہنچ سے دور کرتا رہتا ہے۔

ہم اور آپ اپنے دکھوں، اپنی ذلتوں، تکلیفوں اور اذیت ناک تجربات کو بترنج بھولتے جاتے ہیں۔ اسی کو صبر آنا کہا جاتا ہے۔ یہ ساری تکلیف وہ یادیں ہمیشہ کے لیے محو ہیں ہوتیں، کہیں محفوظ رہتی ہیں لیکن آپ کی فوری پہنچ سے دور۔

اگر دماغ میں یہ صلاحیت نہ ہوتی تو آدمی اپنی ذلت کو کبھی نہ بھول پاتا۔ ماں اپنے مرنے والے بچے کا غم کبھی نہ فراموش کر پاتی۔ جن مشکلات سے کبھی ہم گزرے تھے ان کی اذیتیں ہم کبھی نہ بھول پاتے۔ انتقام کا جذبہ دماغ میں طوفانِ اٹھائے رکھتا اور زندگی جہنم بن کر رہ جاتی۔

(اقتباس: جسم کے عجائب)

گفتگو کی صلاحیت اور اللہ کی حکمتیں

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

”مفضل! غور کرو اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ایک اور عظیم نعمت پر، جس کے ذریعے انسان اپنے باطنی خیالات، حاجت، تکلیف، خوشی، غم، ذہن میں پیدا ہونے والے خیالات اور اپنی کیفیات کو دوسرے سے بیان کر سکتا ہے اور یہ نعمت ہے بولنے اور گفتگو کرنے کی (آن مول) صلاحیت۔ اگر یہ نعمت انسان کے پاس نہ ہوتی تو یہ دوسرے حیوانوں کی طرح ہوتا جونہ اپنے دل کی بات کسی سے کہہ سکتے ہیں اور نہ دوسری کی بات سمجھ سکتے ہیں۔“
(یعنی نہ وہ ہماری بات سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہم ان کی بات کو سمجھ سکتے ہیں)

نوت: بولنا اور اسے سن کر سمجھنا

جس طرح گفتگو کرنے کی صلاحیت اللہ ربِ کریم کی عظیم نعمت ہے اسی طرح گفتگو کو سننا اور اسے سمجھنا بھی اللہ تعالیٰ کے عظیم احسانات میں سے ہے۔ یہ دونوں صلاحیتیں ایک دوسرے سے وابستہ اور ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ہیں۔

یعنی اگر بولنے کی صلاحیت ہوتی لیکن اس گفتگو کو سننے اور سمجھنے والا کوئی نہ ہوتا، اسی طرح سننے اور سمجھنے کی صلاحیت انسان میں موجود ہوتی اور بولنے یا گفتگو کرنے والا کوئی نہ ہوتا تو دونوں ہی صلاحیتیں موجود ہونے کے باوجود انسان کے لیے بیکار ہوتیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو

دونوں ہی صلاحیتوں سے بیک وقت نوازا ہے۔ ان دونوں صلاحیتوں کا بیک وقت موجود ہونا اور ایک دوسرے سے ہم آہنگ (Compatible) ہونا بھی اللہ کی عظیم نشانیوں میں سے ہے۔

نوٹ: بولنے کے عجائب

بولنے اور سننے کے عمل کی سائنسی تشریح ہم گزشتہ ابواب میں پیش کرچکے ہیں کہ یہ حیران کن عمل کس طرح وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ آپ ان کے بارے میں تفصیل جاننا چاہیں تو گزشتہ ابواب دیکھئے اور تفصیلات کے متلاشی ہوں تو ہماری کتاب ”جسم کے عجائب“ کا مطالعہ فرمائیے۔

تحریر کی صلاحیت

گفتگو کرنے کی صلاحیت کے بعد امام جعفر صادق علیہ السلام نے مفضل ابن عمرؓ کو لکھنے پڑھنے کی صلاحیت کی طرف متوجہ فرمایا۔

”مفضل تم غور کرو، تو دیکھو گے کہ لکھنے (پڑھنے) کی صلاحیت بھی انسانوں پر اللہ تعالیٰ کا ایک عظیم احسان ہے، جس کے ذریعے گزشتہ زمانے کے افراد (علوم، تہذیبوں اور معاشروں) کے حالات سے آگئی حاصل ہوتی ہے اور موجودہ زمانے کے لوگوں کے حالات مستقبل میں آنے والوں کے لیے ضبط تحریر میں لائے جاتے ہیں۔“

تحریر ہی کے ذریعے مختلف علوم و آداب کی کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ گفتگوؤں، معابر و اور حساب کتاب کو بھی تحریر ہی کے ذریعے ایک عہد سے دوسرے عہد اور ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل کیا جاتا ہے۔

لکھنے اور قلم بند کرنے کی یہ صلاحیت نہ ہوتی تو ایک عہد کی تاریخ دوسرے عہد تک منتقل نہیں ہو سکتی تھی۔ ایک زمانے کی خبریں دوسرے زمانے سے بالکل منقطع ہو جاتیں۔ علوم معدوم ہو جاتے، تہذیبوں کے حالات تلف ہو جاتے، جو لوگ اپنے وطن سے دور ہیں انہیں اپنے گھر کی خبر ملتی اور نہ وطن میں موجود لوگوں کو سفر پر جانے والوں کی خیریت!

اسی طرح دینی معاملات کے ساتھ ہوتا کہ دین کے احکامات، آداب، روایات، تعلیمات، دوسرے زمانے میں مفقود ہو جاتیں، ان میں خلل واقع ہوتا اور جن چیزوں کا جاننا ضروری ہے ان کا جاننا ممکن نہ رہتا۔“

کیا انسان خود بے خود بولنا اور لکھنا سیکھ گیا؟

”مفضل! ممکن ہے تم سوچو کہ لکھنے (اور پڑھنے) کی ان صلاحیتوں کو انسان نے اپنی کوشش، تجربے اور ذہانت کے ذریعے حاصل کر لیا ہے۔ یہ چیزیں انسان کی طبیعت و فطرت میں پیدا نہیں کی گئی ہیں؟ اسی طرح مختلف فرقوں (یعنی قوموں) کی زبانیں ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ زبانوں کی طرح تحریریں بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ مثلًاً عربی، سریانی، رومی (انگریزی) اور عبرانی رسم الخط ہیں۔

اب اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ یہ زبانیں اور تحریریں انسانوں نے خود بے خود اپنے تجربات سے بنالی ہیں تو اسے جواب دیا جائے گا کہ اگرچہ دونوں کاموں میں انسان کی کوشش اور عمل کو دخل ہے لیکن جس چیز کے ذریعے انسان اس تدبیر فعل اور کامیابی تک پہنچا کہ لکھ، پڑھ، سن اور بول سکے وہ یقیناً عطیہ خداوندی ہے اور اس کے اسباب و آلات کو اللہ رب کریم نے ان کے جسم اور فطرت میں پیدا کیا ہے۔

مثلاً دماغ، عقل اور اعضاء۔ تو اگر عقل نہ ہوتی، دماغ نہ ہوتا تو انسان کسی چیز کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اگر زبان نہ ہوتی جس سے وہ گفتگو کرتا اور ذہن نہ ہوتا جس کے ذریعے وہ سوچ کر بولتا تو زبانیں کس طرح وجود میں آتیں؟

اسی طرح اگر سوچنے سمجھنے کی پیش بہا صلاحیت کے ساتھ ساتھ اسے (خاص طرح کے) ہاتھ اور انگلیاں نہ دی گئی ہوتیں تو وہ قلم کس طرح تھامتا اور کس طرح لکھنے کے قابل ہوتا۔“

نوٹ: ہاتھوں کی جلد، انگلیاں اور انگوٹھا

پھیپھڑوں سے نکلنے والی ہوا، حلق کے اندر موجود ”ووکل کورڈز“ اور پھر منہ میں آکرتا لو، دانتوں، زبان اور ناک کی مدد سے اس طرح ایک بامعنی لفظ یا جملے میں تبدیل ہو جاتی ہے؟ اس کی کسی قدر تفصیل ہم گز شتہ ابواب میں پیش کر چکے ہیں۔ انہی ابواب میں ہم دماغ اور ہاتھوں یا

انگلیوں کے درمیان باہمی رابطوں کے بارے میں بھی قارئین کو میڈیا کل سائنس کی روشنی میں کسی حد تک بتاچکے ہیں۔ یہاں صرف ہم کھلنے اور بند ہونے والی انگلیوں، انگوٹھے اور ہاتھوں کی جلد کے بارے میں عرض کریں گے۔

لکھنے کے عمل میں کئی باتیں قابل توجہ ہیں۔ مثلاً ہاتھوں کی جلد۔ ہاتھوں کی وہ جلد جو ہتھیلی کی سمت ہے قدرت کے عجائبات میں سے ہے۔ اس جلد کو اگر آپ مذہب شیشے سے دیکھیں تو پتا چلے گا کہ اس جلد پر باریک لائن موجود ہیں (یہ لائن آپ ہاتھ یا انگلیوں کا پرنٹ بنایا کر بھی دیکھ سکتے ہیں)

اس کے ساتھ ساتھ ہتھیلی کی سمت والی کھال میں ایک خاص طرح کی نبی ہر وقت موجود رہتی ہے جو قلم یا دوسری چیزوں کو مضبوطی سے پکڑنے میں آپ کی مدد کرتی ہے۔ سخت سردی میں یہ نبی غائب ہو جاتی ہے۔ اسی لیے اس زمانے میں ہاتھ کی گرفت یا پکڑ معمول کے مطابق نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ آپ کوئی بھی چیز مثلاً قلم، بیٹ، کار کا اسٹیرِ نگ یا قلم پکڑتے ہیں تو انگلیوں اور انگوٹھے کی مدد سے پکڑتے ہیں۔ آپ کوئی سوئی یا پن بھی انگلیوں اور انگوٹھے کے بغیر نہ اٹھا سکتے ہیں نہ پکڑ سکتے ہیں۔ دراصل انگوٹھا اور انگلیاں مل کر کسی پلاس کی طرح کام کرتے ہیں۔

اگر کسی شخص کا انگوٹھا کسی حادثے میں کٹ جائے تو اس کے لیے کسی بھی چیز کو اٹھانا، پکڑنا یا کام کرنا ممکن نہیں رہے گا۔ انگوٹھا اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو ہتھیلی کی حیران کن جلد اور چاروں انگلیاں مل کر بھی وہ کام سرانجام نہیں دے سکتی تھیں جو کام انگوٹھے کی موجودگی میں بہ آسانی سے سرانجام دیئے جاتے ہیں۔

ممکن ہے آپ کے ذہن میں خیال آئے کہ جدید زمانے میں کی بورڈ (Key Board) کے ذریعے صرف ایک انگلی یا انگوٹھے سے لکھا جا سکتا ہے۔ یہ بات درست ہے لیکن پھر وہی سوال سامنے آئے گا کہ انسان کو یہ عقل کس نے عطا کی کہ وہ لکڑی کی تختی یا ٹین کی سلیٹ سے کی بورڈ (Key Board) یا آئی پیڈ (Ipad) تک پہنچ سکے!

دوسرے جانداروں کو دیکھو

امام علیہ السلام نے تحریر و کلام جیسی نعمتوں کے حوالے سے مفضل ابن عمرؓ سے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا:

”مفضل! اس بات (یعنی تحریر، تقریر) کی اہمیت و افادیت سمجھنے کے لیے دوسرے جانداروں کو دیکھو جن میں نہ (بامعنى) کلام کی طاقت ہے، نہ ان کے پاس ایسے اعضاء ہیں کہ وہ کوئی چیز تحریر کر سکیں۔

(قابل توجہ بات یہ بھی ہے کہ چمپیزی بندرا نے انسان سے ملتے جلتے ہوتے ہیں۔ ان کے پاس دماغ، ہاتھ پیر انگلیاں، منہ زبان حلق سب کچھ موجود ہیں لیکن لکھنا تو درکنار وہ صرف وہی آواز نکال سکتے ہیں جسے دوسرے بندر سمجھ سکیں۔)

اللہ کا خاص احسان

امام علیہ السلام نے فرمایا:

”اس سے معلوم ہوا کہ یہ باری تعالیٰ جَلَّ شَانَه“ کا قانون فطرت ہے جس پر انسان کو پیدا کیا گیا اور یہ انسانوں پر ایک احسان ہے..... تو جو کوئی اس کا شکر ادا کرے گا، اسے ثواب ملے گا اور جو کفر ان نعمت کرے گا تو اللہ کو اس کی کوئی پرواہیں ہے کیوں کہ اللہ جل شانہ تمام جہان سے مستغنى ہے۔ (نہ ہمارا شکر اس کی عظمت میں اضافہ کر سکتا ہے اور نہ ہماری ناشکرگزاری اس کی عظمت کو کم کر سکتی ہے۔)

انسان کو وہ علم دیا گیا جو اس کے لیے ضروری ہے
”مفضل! یہ بھی دیکھو کہ انسان کو ان سب چیزوں کا علم دیا
گیا ہے جن میں اس کے دین اور دنیا کی بھلائی ہے۔ مثلاً اللہ
تعالیٰ کی معرفت، جو دلیلوں اور شہادتوں کے ذریعے (عقلی
بنیادوں پر) حاصل کی جائے، اس کے ساتھ ان تمام کاموں کی
معرفت جو اس پر واجب ہیں۔

مثلاً انصاف کرنا اور اس سے پسند کرنا، والدین کے ساتھ نیکی
کرنا، محتاجوں کی مدد کرنا، اچھائی کو پسند کرنا، برائی کو ناپسند کرنا،
یہ سب باتیں انسان کی فطرت و ضمیر میں رکھ دی گئی ہیں۔ یہ وہ
صفات ہیں جو تمام امتوں اور مذاہب میں فطرتاً موجود ہیں خواہ
وہ ہمارے مخالف ہوں یا موافق۔

اسی طریح انسان کو ان تمام کاموں اور چیزوں کا بھی علم عطا
کیا گیا جن میں اس کی دنیا کی بھلائی ہے۔ مثلاً زراعت،
باغبانی، زمینوں کا آباد کرنا، مویشی پالنا، زمین میں کنویں کھو دنا،
پانی کے چشموں کو استعمال کرنا، جڑی بوٹیوں کی شناخت جن سے
امراض کا علاج کیا جاتا ہے۔ اسی طریح جواہرات (یا سونے
چاندی) کی کانوں کی پہچان، کشتی پر سوار ہونے (یعنی کشتی چلانے)،
دریا میں غوطہ خوری کرنے، جنگلی جانوروں چوپائیوں اور پرندوں

کاشکار، مجھلیوں کو پکڑنے کے طریقے، صنعت و حرفت اور اس میں طرح طرح کی تدبیریں، تجارت اور معیشت اور حساب کتاب کا علم اسے دیا گیا۔

ان کے علاوہ بے شمار علوم ہیں جنہیں بیان کیا جائے تو بات لمبی ہو جائے گی۔ غرض انسان کو وہ علوم دیے گئے یا طریقے بتائے گئے جو اس کی دنیا اور آخرت کی کامیابی کے لیے ضروری ہیں۔

زیادہ تعداد ان باتوں کی ہے.....

”لیکن مفضل! زیادہ تعداد ان باتوں (علوم) کی ہے جن کا جاننا انسان کی طاقت سے باہر ہے اور نہ اس میں اس قدر طاقت و صلاحیت ہے (کہ وہ کائنات کے ان سربست رازوں کو سمجھ سکے)۔ تو ایسی چیزوں کا علم انسان کو نہیں دیا گیا۔ مثلاً جور حم مادر میں ہے یا جو کچھ لوگوں کے دلوں میں ہے۔ اس کے علاوہ علم غیب، یا بعض وہ چیزیں جو پہلے ہو چکی ہیں جیسے آسمان کے اوپر اور زمین کے نیچے کی چیزوں کا جاننا اور جو دریاؤں کے اندر ہیں اور کائنات میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں۔

(تو یہ علم کی تقسیم بھی یہ ظاہر کرتی ہے کہ کوئی منصوبہ ساز ہے جس نے یہ ساری باتیں اپنی مصلحت و مشیت کے مطابق طے کی ہیں اور انسانوں کے لیے ان کا حصول آسان کر دیا ہے)

نوٹ: علم کی حد کیا ہے؟

علوم بے شمار ہیں اور انسانی عقل سب کو سمجھنے سے ہمیشہ معدود رہے گی۔ بہر حال خود عقل بھی وقت، زمانے، تجربات و مشاہدات کے ساتھ بڑھتی رہتی ہے۔ انسان کے علم میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ سو سال پہلے انسان جن کاموں کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا، ان کا سرانجام دینا آج ایک معمول کی بات ہے لیکن علم الہی، علم غیب انسان کے لیے ہمیشہ لامحدود رہے گا اور ناقابلِ حصول بھی۔

اس کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ کائنات میں سوکھر بکھشاں میں موجود ہیں جن میں سے ہماری کھکشاں (ملکی وے) یعنی دودھیا کھکشاں میں سورج جیسے سوارب ستارے موجود ہیں۔ اس کھکشاں میں ہمارے نظامِ سماں کی مثال صحراء میں ایک ذرے سے بھی کم تر ہے۔

انسان نامی یہ مخلوق اس نظامِ سماں کے صرف ایک سیارے یعنی زمین پر پائی جاتی ہے۔

سائنس دان اپنی تمام تر سائنسی ترقی کے باوجود ابھی تک نظامِ سماں کے صرف دو سیاروں، چاند اور مریخ تک کسی قدر رسائی حاصل کر سکے ہیں۔ دودھیا کھکشاں اور دوسری سوکھر بکھشاں میں کیا ہے، اسے معلوم کرنے کا بھی تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ (فلکیات کے حوالے سے مزید معلومات آپ امام علیہ السلام کے تیرے پیچھر میں تفصیل سے ملاحظہ کر سکیں گے)

آج کے زمانے کی جدید ترین دوربینیں جوز میں کے باہر خلا میں تیر رہی ہیں اور صرف تیس کروڑ نوری سال (لائٹ ایئر ز) تک دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ اس ناقابلِ تصور فاصلے کے بعد بھی انہیں کائنات کا اختتام نظر نہیں آتا۔ اس آخری حد پر روشنی کے عظیم مرکز کی روشنی کے تجزیے سے پتا چلا ہے کہ وہاں جو کچھ ہے وہ یہاں (یعنی نظر آنے والی کائنات) سے بالکل مختلف ہے۔

خالی سائنس دانوں نے اسے ”ایک متوازی کائنات (The Parallel Universe) کا نام دے رکھا ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کا قول ہے:

”خداوند عالم نے ایک لاکھ قندیلوں پیدا کی ہیں اور انہیں معلق کر دیا ہے۔ عرش اور تمام آسمان و زمین اور ان میں جو کچھ ہے حتیٰ کہ جنت و جہنم بھی ایک قندیل کے حلقتے میں واقع ہیں۔ باقی قندیلوں میں جو کچھ ہے اسے اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔“ (حوالہ: انوار النعمانیہ)

امیر المؤمنین علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ ”علم (بقدر) تین بالشت ہے جو پہلی بالشت تک پہنچا وہ متکبر ہو گیا۔ جو دوسری بالشت تک پہنچا اس نے انکساری اختیار کی اور جس نے تیسرا بالشت تک رسائی حاصل کر لی تو اسے وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ اسے کچھ معلوم نہیں۔“ واضح رہے کہ علم غیب ان سب سے ماوراء اور بالاتر ہے۔

اگر علم غیب بھی انسانوں کو دے دیا جاتا!

امام علیہ السلام نے مفضل بن عمر سے اثباتِ وجود خدا کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرمایا۔

”دیکھو مفضل! انسان کو ان تمام چیزوں کا علم دیا گیا جس کی اسے دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے ضرورت تھی۔ اور یہ بھی دیکھو! کہ اس کے برعکس اسے بے شمار لا تعداد چیزوں کو جاننے سے روک دیا گیا، تاکہ اسے اپنی حیثیت کا احساس ہو جائے۔ اس میں غرورو تکبر نہ پیدا ہو۔

اب دیکھو! ان دونوں ہی باتوں میں اس کے لیے بہتری ہے اور اس میں اس بات کی بھی واضح دلیل موجود ہے کہ اس کا کوئی خالق ہے جس نے ایک منصوبہ کے تحت اسے کچھ علم عطا کیا اور بے شمار علوم سے اسے محروم رکھا۔

اگر اسے تمام کائنات کا علم دے دیا جاتا۔ اسے ماضی عال اور مستقبل کے حالات و واقعات، حادثات اور ان سے بچنے کا علم بھی دے دیا جاتا تو وہ پھر خود ہی کو خدا سمجھنے لگتا اور اپنے سے برتر ذات یعنی اللہ تعالیٰ کے آگے سر کیوں جھکاتا؟

اب اسے معلوم ہے کہ وہ ایک ناقص وجود ہے۔ نہ اسے اپنی زندگی کا پتا ہے، نہ موت کا۔ نہ وہ بیماری کو روک سکتا ہے۔ نہ صحت حاصل کرنا اس کے بس میں ہے۔ (نہ وہ حوادث کو روک سکتا ہے، نہ زمین و آسمان کی گردش کو)۔

مدتِ حیات کا علم کیوں نہیں دیا گیا؟

”مفضل کیا تم نے کبھی سوچا کہ انسان کو اس کی مدتِ حیات کا علم کیوں نہیں دیا گیا اور اگر اسے اپنی عمر اور موت کا علم دے دیا جاتا تو انسان کی زندگی کس قدر تلخ ہو جاتی۔

مثلاً اگر اسے معلوم ہوتا کہ میں فلاں سال فلاں تاریخ، فلاں وقت، فلاں بیماری، حادثے یا قدرتی آفت کے سبب مر جاؤں گا۔ تو ایسا انسان مرنے سے پہلے مر جایا کرتا۔

اور اگر اسے معلوم ہوتا کہ اس کی زندگی کی مدت طویل ہے تو اسے اپنی بقا پر بھروسہ ہو جاتا اور اس خیال سے گناہ کرتا رہتا کہ آج تولذت حاصل کرلوں، فائدہ حاصل کرلوں، پھر مرنے سے اتنے دن پہلے توبہ کرلوں گا۔

یہ درست ہے کہ اللہ کی رحمت و سعیج ہے اور وہ مرنے سے پہلے بھی بندے کی توبہ قبول کرتا ہے لیکن یہ بات باری تعالیٰ کو پسند نہیں کر لوگ اس طرح سوچیں اور سوال یہ بھی ہے کہ کیا ضروری

ہے کہ بندے کو مرنے سے پہلے توبہ کی توفیق بھی حاصل ہو جائے!
(حوادث اور قدرتی آفات میں جو لوگ اچانک مر جاتے ہیں
انہیں اکثر توبہ کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔)

ایک مثال سے سمجھو

اسے ایک مثال سے سمجھو! فرض کرو تمہارا ایک غلام ہے۔ وہ سال بھر تو تمہیں اپنی نافرمانی سے ناراض رکھے اور سال کے ایک دن یا ایک ماہ تمہاری پسند کے کام سرانجام دے۔ تمہیں خوش کرنے کی کوشش کرے اور پھر کچھ عرصے بعد وہ اپنی پرانی روشن کو اختیار کر لے تو تم اپنے اس غلام کو کس مرتبے پر رکھو گے۔
تمہاری نظر میں اس کی کیا وقعت ہو گی؟

اسی لیے مدتِ حیات کا علم انسان کو نہیں دیا گیا کہ انسان ہر وقت اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے کہ نہ جانے کب موت آجائے۔ یہ خوف اسے گناہوں سے دور رکھے گا۔

ہاں!..... تم نے صحیح سوچا کہ اب جبکہ مدتِ حیات کا کسی کو کوئی علم نہیں ہے کہ کس لمحے اسے موت آجائے گی، اس کے باوجود بھی لوگ بدکاریوں اور گناہوں سے باز نہیں آتے.....
تو ہم اس کا جواب یہ دیں گے کہ اس معاملے میں تدبیر تو ایسی ہی کی گئی ہے کہ انسان گناہوں سے بچا رہے لیکن اگر کوئی

شخص اس کے باوجود گناہوں پر اصرار و تکرار کرے تو یہ اس کے مزاج کی بے اعتدالی اور دل کی سختی ہے۔ البتہ اس میں اصل تدبیر (پلانگ) کی کوئی خرابی نہیں ہے۔

مریض پر ہیز ہی نہ کرے

”دیکھو! معا الجین یا طبیب اپنے مریض کو پر ہیز بھی بتاتے ہیں اور دوا بھی دیتے ہیں کہ فلاں فلاں چیز استعمال نہ کرنا اور اس دوا کو اس مقدار میں اور اتنے وقٹے کے بعد استعمال کرنا تو انشاء اللہ تکلیف سے جان چھوٹ جائے گی۔ اب اگر مریض بتایا ہوا پر ہیز نہ کرے، پابندی سے وقت پر دوانہ استعمال کرے اور اس کا مرض بڑھتا ہی جائے تو اس میں طبیب، معانج یاد دوا کا کیا قصور! اور یہ بھی تو دیکھو کہ ایسی صورت میں کہ اسے معلوم نہیں کہ کس لمحے موت آجائے گی اس کے باوجود وہ گناہوں سے باز نہیں آتا تو اگر اسے اپنی لمبی عمر کا علم (اور یقین) ہوتا تو اس کا کیا حال ہوتا؟

اب یہ انسان کو گناہوں سے بچانے کے لیے اللہ کی ایک تدبیر ہے تو جو اس سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے وہ نیک اعمال سرانجام دیتا ہے اور جو اس کے بر عکس کام کرتا ہے تو بر عکس انجام سے دوچار ہوتا ہے۔

کچھ خواب سچے، کچھ خواب جھوٹے۔ ایسا کیوں؟
”مفضل! یہ جورات میں یادن میں نیند کی حالت میں خواب آتے
ہیں، ان پر تم نے کبھی غور کیا؟ ان میں اللہ کی کیا مصلحت و مشیت ہے۔

کچھ خواب سچے کیوں ہوتے ہیں
اور زیادہ تر خواب جھوٹے اور بے معنی کیوں ہوتے ہیں؟
بات دراصل یہ ہے کہ اگر سارے ہی خواب سچے ہوا کرتے
تو آدمی خود کو انبیاء کے درجے پر سمجھتا اور اگر سارے ہی خواب
بے معنی اور جھوٹے ہوتے تو ان کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اسی
لیے سچے خوابوں کو جھوٹے خوابوں سے مخلوط کر دیا گیا ہے۔ تو
کبھی تو خواب سچے ہوتے ہیں تاکہ انسان ان کے ذریعے اپنی
زندگی میں، یا کار و بار میں فائدہ اٹھائے جس کے بارے میں
اسے متوجہ کیا گیا ہے۔ جس نقصان سے بچنے کا اسے اشارہ کیا
ہے، اس سے بچنے کی تدبیر کرے۔

جھوٹے خواب اس لیے سچے خوابوں میں شامل کر دیے
جاتے ہیں کہ انسان ان پر پورا ہی بھروسانہ کر لے اور ہر معاملے
میں خوابوں کے انتظار میں نہ بیٹھا رہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ اگر
خواب سچے ہی ہوا کرتے تو انگ اُن سے فائدہ اٹھاتے یا ان
کے ذریعے نقصان سے بچنے کی تدبیر کر لیا کرتے تو پھر وہ اللہ

تعالیٰ کی ذات کی طرف کم ہی متوجہ ہوا کرتے (انہیں اپنی مشکل یا پریشانی میں دعا مانگنے کی ضرورت ہی نہ رہتی۔)

نوٹ: خواب اور حقیقت

خواب دیکھنا انسان کی ایک انفرادیت ہے۔ دوسرے ذی حیات خواب نہیں دیکھتے لیکن یہ خواب آتے کہاں سے ہیں، یہ ہمارے بس میں کیوں نہیں ہوتے کہ ہم اپنی پسند کا خواب دیکھ سکیں۔ ہم خوابوں میں سفر کرتے ہیں۔ دوڑتے بھاگتے ہیں، رنگوں، خوبصوروں، ذائقوں، لذتوں، چہروں، مقامات، اور آوازوں کو دیکھتے، سوگھتے، چکھتے، محسوس کرتے اور پہچانتے ہیں جب کہ نیند میں ہم بے حرکت پڑے ہوتے ہیں اور ہمارے پانچوں حواس معطل ہوتے ہیں۔

تو پھر ہم کن حواسوں سے سنتے، دیکھتے، چکھتے، محسوس کرتے، اور پہچانتے ہیں؟ وہ کون سے پاؤں ہیں جن سے ہم دوڑتے ہیں؟ ہم کسی چیز کو کن ہاتھوں سے خواب کے عالم میں چھوٹے ہیں؟ خواب میں ہم دشمن یا کسی خوفناک چیز سے ڈر کر بھاگتے ہیں تو آنکھ کھلنے پر ہماری سانس تیز تیز چل رہی ہوتی ہے، ہمارا دل بری طرح دھڑک رہا ہوتا ہے اگرچہ ہمارا جسم تو سکون سے بستر پر پڑا ہوتا ہے۔ ان سارے موضوعات پر غور کیا جانا چاہیے!

دنیا میں ضروریاتِ زندگی کی فراہمی

امام جعفر صادق علیہ السلام نے مفضل ابن عمر سے فرمایا:

”اب ذرا ایک سرسری سی نظر ڈالوں چیزوں پر جو انسان کے لیے اس دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہیں اور یہ بھی دیکھو کہ انہیں کس طرح فراہم کیا گیا۔ سب سے پہلے تو مٹی کو دیکھو جس کے ذریعے مکان بنائے جاتے ہیں۔“

اگر علم غیب برسی بانسانوں کو دے دیا جاتا!

(مٹی نہ ہوتی تو کھیتی باری بھی ممکن نہیں تھی۔ فصلیں، نباتات، پھل، انانج، معدنیات، سب مٹی ہی سے حاصل ہوتی ہیں انسانوں اور جانوروں کے لیے تمام غذائی اجزاء زمین یا مٹی ہی میں پائے جاتے ہیں۔)

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

”پھر اسی طرح پتھر، لکڑی، سونا چاندی، تانبہ، جواہرات، انانج، پھول، گوشت، خوشبودار مصالحے، جڑی بوٹیاں، دوائیں، چوپائے، راکھ، چونا، ریت، ان کی تعداد، ان کے فائدے اور انہیں انسان کہاں کہاں استعمال میں لاتا ہے اس کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔

تو مفضل! ان سب چیزوں کی موجودگی بتاتی ہے کہ یہ خود بخود موجود نہیں ہو گئیں بلکہ ان کا کوئی پیدا کرنے والا ہے جس نے ہر چیز کو ایک خاص مقدار میں پیدا کیا اور بہت سی مصلحتوں اور حکمتوں (اور الگ الگ خصوصیات) کے ساتھ پیدا کیا اور ساتھ ہی اس نے انسان کو وہ فہم و فراست بھی عطا کی جس کے ذریعے وہ ان چیزوں کو مختلف مقامات سے حاصل کر سکے اور ان سے فائدہ اٹھا سکے۔

چیزوں مہیا کر دی گئیں لیکن.....

امام علیہ السلام نے فرمایا:

”دیکھو کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی ضرورت کی تمام چیزوں،

زمین پر مہیا کردی ہیں۔ ان سے فائدہ اٹھانے کے لیے اسے عقل
عطای کردی اور انہیں تلاش کرنے اور اپنے لیے قابل استفادہ
بنانے کے لیے (عقل) ہاتھ، پیر، آنکھیں، کان وغیرہ، سب اسے
دے دیے لیکن ان چیزوں کو بالکل تیار حالت میں پیدا نہیں کیا۔
ان چیزوں کو استعمال میں لانے کے قابل بنانا انسان کی ذمے
داری قرار دی گئی۔

مثلاً اناج پیدا کیا گیا لیکن اسے صاف کرنے، پیسے، آٹا
بنانے اور روٹی پکانے کا کام انسان کو خود کرنا ہے۔ روٹی تو موجود
ہے لیکن اسے پودے سے نکالنے، دھنکنے، کاتنے اور پھر اس سے
لباس بنانے کی ذمے داری انسان کی ہے۔

چہلوں کے درختوں کو خلق کیا گیا لیکن انھیں لگانا، بونا، ان
کو سینچنا، ان کی نگہداشت انسان کے حوالے کر دی گئی۔ جڑی
بوٹیاں پیدا کی گئیں لیکن مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر انہیں
مختلف مقامات سے جمع کرنا، انہیں آپس میں ملا کر، رگڑ پیس
کر، اُبال کر، عرق نکال کر ان سے دوائیں بنانا انسان کا
اپنا کام ہے۔

اسی طرح معدنیات کو اللہ نے پیدا کیا لیکن انہیں پہاڑوں
سے نکالنا اور ان سے فائدہ اٹھانا، انسان کی ذمہ داری ہے۔“

اگر تمام ضروریات تیار حالت میں مل جایا کرتیں.....

”اب تم سوچو گے کہ اگر تمام چیزیں بالکل تیار حالت میں انسان کو مل جایا کرتیں، مثلاً پکی پکائی روئی، لباس، جوتے، زیورات، ہتھیار، مکان، کشتی، یہ سب انسان کو تیار شدہ مل جایا کرتیں تو زیادہ بہتر ہوتا!

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر انسان کو اس کی تمام ضروریات کسی کوشش اور جدوجہد کے بغیر ہی حاصل ہو جاتیں تو انسان غرور و تکبر سے زمین پر پاؤں ہی نہ رکھتا اور ایسے کام کرنے لگتا جن سے اس کی تباہی و بر بادی یقینی تھی۔ پھر یہ بھی ہے کہ اسے کسی شے کی قدر و قیمت کا احساس ہی نہ ہوتا۔ کیوں کہ جو چیز بغیر محنت کے حاصل ہو جائے انسان اس کی قدر ہی نہیں کرتا۔

(اس کی ایک مثال تو ہمارے اعضاء ہی ہیں۔ ہمیں کسی عضو کی موجودگی کا احساس اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک اس میں کوئی خرابی پیدا نہ ہو جائے)

نوٹ: ایک مثال

اس کی ایک اور مثال اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ”ہوا“ ہے۔ ہم ہر وقت اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ہر وقت اس ہوا میں سانس لیتے ہیں لیکن ہمیں سانس لینے کا احساس تک نہیں ہوتا کہ یہ سانس جو ہم لے رہے ہیں تو یہ آکسیجن ہمارے جسم میں جا کر ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کی کتنی نعمتوں کو قابل استفادہ بنارہی ہے۔ یہ ہوا اگر چند منٹ کے لیے ہمارے جسم کو فراہم نہ ہو سکے تو انسان معذور ہو سکتا

ہے یا اس کی موت واقع ہو سکتی ہے۔ یہی آکسیجن جو ہم اپنی پہلی سانس سے آخری سانس تک بغیر کسی کوشش و جدوجہد کے استعمال کرتے رہتے ہیں، اگر کسی مریض کو مصنوعی طور پر فراہم کرنا پڑے تو وہ گیس کے سینئنڈر، ماسک اور دوسری طبی سہولتوں کی قدر و قیمت جان سکتا ہے۔ ہم دنیا میں آتے ہی اس ہوا کو استعمال کرنا شروع کر دیتے ہیں اور اکثر لوگ دنیا میں جانے تک اللہ کی اس نعمت کی قدر و قیمت ہی سے بے خبر رہتے ہیں۔ شکر ادا کرنا تو دور کی بات ہے۔

انسان کا مام نہ کرتا تو بڑے مسائل پیدا ہو جاتے

امام علیہ السلام نے فرمایا:

”مفضل! انسان کو کام کرنے والا پیدا کیا گیا ہے۔ تم دیکھتے ہو کہ اگر کسی شخص کے پاس کرنے کو کام نہ ہو تو اس کی زندگی کس قدر تلخ ہو جاتی ہے۔

پھر ضروریاتِ زندگی کی مختلف مقامات پر موجود گی، ان کی تلاش، ان سے مختلف اشیاء کی تیاری، ان کی بار برداری، فروخت اور حساب کتاب میں اللہ نے انسان کے لیے کام اور محنت کے ساتھ ساتھ اسبابِ رزق بھی پیدا کیے ہیں۔“
 ”مثلاً اگر کسی ملک کی تمام صنعتیں بند ہو جائیں تو کروڑوں لوگ بے روزگاری اور بھوک میں بتلاء ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ بیرون زگاری جرام کو جنم دیتی ہے جس سے بدمنی اور خوف پھیلتا ہے۔“

پانی زیادہ پیدا کیا گیا

”مفضل! اس بات کو سمجھو کہ انسان کی اصل معاش و زندگی

روٹی پانی سے ہے۔ روٹی کی نسبت انسان کو پانی کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ وہ بھوک کی نسبت پیاس پر زیادہ صبر نہیں کر سکتا۔ پانی دوسری ضروریات میں بھی کام آتا ہے۔ مثلاً نہانہا دھونا، وضو کرنا، کپڑے دھونا۔ اسے دواوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے اور کھیتوں اور باغوں کو سینخنے میں بھی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے پانی کو فراواں مقدار میں پیدا کیا اور اس کے حصول کو بھی آسان بنایا۔“

(یعنی اسے پانی کو روٹی کی طرح ”پکانا“ نہیں پڑتا بلکہ اسے اسی حالت میں استعمال کیا جاتا ہے۔)

”تو دیکھو! کہ پانی کا حصول آسان اور روٹی کی فراہمی کو مشکل کس نے بنایا؟ کیا ماڈن اور طبیعت (نجپر) میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ دنیا میں آنے والے انسان کی ضروریات (اور اس کے مزاج) کا اندازہ کر سکے اور پھر اس کے مطابق اشیاء کو پیدا کرے؟ ان حکمتوں اور باریکیوں کو وہی ذات سمجھ سکتی ہے جس نے انسان کو پیدا کیا اور اس کی زندگی کے لیے دنیا میں سامان حیات فراہم کیے۔“

اس کے بعد امام علیہ السلام نے ایک بہت ہی حیران کن موضوع پر گفتگو فرمائی کہ ہر انسان کو ایک مختلف شکل و صورت پر کیوں پیدا کیا گیا؟ اس کی تفصیل و تشریح اگلے باب میں ملاحظہ فرمائیں۔

باب : 21

ہر انسان دوسرے سے مختلف کیوں؟

امام جعفر صادق علیہ السلام نے اثبات وجودِ خدا کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے مفضل ابن عمرؓ کو ایک حیران کن موضوع کی طرف متوجہ فرمایا۔ یہ ایک ایسا موضوع تھا جس پر امامؓ سے صد یوں پہلے اور صد یوں بعد تک کرہ ارض پر موجود کسی فلسفی، حکیم، سائنس دان یا ماہر حیاتیات نے غور تک نہیں کیا تھا۔ اس سوال کا جواب سائنس دانوں کی سمجھ میں آنے کے اسباب 1953 میں DNA نامی مالکیوں کی دریافت کے بعد فراہم ہوئے۔ ہر انسان دوسرے انسان سے مختلف کیوں ہیں؟ اس کی وجہات 2003ء کے بعد ماہرین حیاتیات کو معلوم ہونا شروع ہوئیں۔

(حوالہ: (Genes & DNA)

امام علیہ السلام نے فرمایا:

”مفضل کیا تم نے کبھی اس بات پر غور کیا کہ جانوروں کی شکلیں ایک سی ہوتی ہیں۔ (مثلاً کوئے، چڑیاں، ہرن، ہاتھی، وغیرہ سب کی شکلیں ایک دوسرے کی کاپی ہوتی ہیں۔ ہم اور آپ انہیں الگ الگ نہیں پہچان سکتے۔)

تم ہرنوں کے گلے کو دیکھو، یا چکوروں یا تیتروں کے جھنڈ پر نظر ڈالو تو یہ سب ایک سے دکھائی دیں گے۔ تمہیں ان میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوگا۔

اس کے برعکس انسانوں کو دیکھو تو ہر ایک کی شکل و صورت

اور ساخت ایک دوسرے سے بالکل مختلف نظر آئے گی۔ یہاں تک کہ تمہیں دو آدمی بھی بالکل ایک شکل، قد و قامت (چال ڈھال، رنگ اور مزاج) کے شاید ہی نظر آئیں۔“ (یہ بات بھی وجود باری تعالیٰ کی واضح دلیل ہے کہ اس نے جانوروں کو ہم شکل اور انسانوں میں سے ہر انسان کو ایک دوسرے سے بالکل مختلف شکل و صورت پر پیدا کیا اور اس میں اس کی بڑی مصلحتیں ہیں جیسا کہ آپ آئندہ سطور میں پڑھیں گے)

ایسا کیوں ہوا؟

”تو مفضل! تم نے کبھی سوچا کہ ایسا کیوں ہے؟“ ”ویکھو مفضل! ہر انسان دوسرے انسان سے مختلف اس لیے ہے کہ انسانوں میں اس کی ضرورت ہے کہ ہر انسان کو الگ سے پہچانا جاسکے۔ ہر ایک کی الگ سے شناخت ہو سکے۔ انسانوں کے درمیان بہت سے باہمی معاملات ہوتے ہیں۔ لین دین ہوتا ہے اس لیے ہر انسان کو ایک الگ شناخت دی گئی۔ (مجرم اور مخصوص، فلام اور مظلوم، قرض دینے والے اور قرض لینے والے کو پہچانا ہوتا ہے۔ پھر انسانوں کے درمیان حلال و حرام کے رشتے ہیں)

جانوروں میں ایسے معاملات نہیں ہیں۔ (وہ مختلف پیدا نہیں کرے گئے۔ جانوروں میں جزا و سزا کا قانون نافذ نہیں ہوتا) اس لیے جانو، اگر ایک دوسرے کے ہم شکل ہوں تو اس سے نظام زندگی میں کوئی خلاں واقع نہیں ہوتا۔“

(نوت: جانور مثلاً کوئے، چڑیاں، پنگوئن، ہر ان وغیرہ اگرچہ ہمیں ایک جیسے نظر آتے ہیں لیکن یہ جانور آپس میں ایک دوسرے کو پہچاننے کی صلاحیت سے مالا مال ہوتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں دوسری طرح کی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔)

جزوال بچے

امام علیہ السلام نے فرمایا:

”انسانوں میں اکثر جزوں بچے ایک دوسرے کے بالکل ہم شکل پیدا ہوتے ہیں تو لوگوں کو ان سے لین دین یا دوسرے معاملات میں خاصی دشواری پیش آتی ہے۔

تمفضل! ذرا اس بات کو سمجھو کہ کس نے بندوں اور دوسری مخلوقات کی تخلیق میں ایسی باریکیاں اور لطائف پیدا کیے جن کا کسی انسان کے ذہن میں تصور میں بھی آنا دشوار (بلکہ ناممکن) تھا۔ کیا کوئی انسان خلقت کی ان باریکیوں کو کامل طور پر جان سکتا ہے۔ کیا طبیعت (نجپر) میں یہ طاقت ہے کہ وہ ان باریکیوں کو سمجھ سکے اور پھر ان حکمتوں کو ضرورت و مواقع کے مطابق پیدا کر سکے! لا حول ولا قوة الا بالله العلي العظيم.

مفضل! اگر تم دیوار پر کسی آدمی کی تصویر بنی ہوئی دیکھو اور تم سے کوئی کہے کہ یہ تصویر خود بے خود دیوار پر بن گئی ہے، کسی بنانے والے نے اسے نہیں بنایا۔ تو کیا تم اس کی بات مان لو گے؟

یقیناً نہیں۔ بلکہ تم کہنے والے کی بات پڑھو گے۔ اس لیے کہ تم جانتے ہو کہ انسان کی تصور یا جو بے حس و حرکت ہوتی ہے وہ بغیر کسی بنانے والے کے نہیں بن سکتی تو ایک زندہ، چلتا پھرتا، عقل، ارادہ رکھنے والا، (عمل اور رد عمل ظاہر کرنے والا) انسان خود بے خود کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔ یقیناً انسان کو کسی نے پیدا کیا ہے اور وہ اللہ کی ذات ہے جو احسن الائقین ہے۔

نوٹ: انسانوں کی شکلیں ایک دوسرے سے مختلف کیوں ہوتی ہیں؟

آئیے، اب چینیک سائنس کی نظر سے دیکھتے ہیں کہ انسانوں کی شکلیں کیوں مختلف ہوتی ہیں اور خلقت کی ان باریکیوں کے بارے میں سائنس دانوں کو گب معلومات حاصل ہوئیں۔ ان سوالوں کے جواب جاننے کے لیے ہمیں ایک سرسری نظر (DNA) ڈی این اے کی دریافت پڑھنا ہو گی۔

ڈی، این، اے کی دریافت کا سہرا دو امریکی سائنس دانوں جیمس وائسن اور فرانز کرک کے سر ہے۔ یہ دریافت انہوں نے 1953ء میں کی تھی۔ ان دونوں سائنس دانوں کو 1962ء میں ان کی اس دریافت پر نوبل پرائز سے سرفراز کیا گیا۔

حقیقت تو یہ ہے DNA کے حوالے سے ابتدائی غور و فکر اور تجربات آسٹریا کے ایک پادری گریگور جوہان مینڈل نے 1856ء میں مژر کے مختلف رنگ کے بھولوں والے پودوں پر کیے تھے اور جیمز Genes کا پتال گالا تھا۔ مینڈل نے اپنے وقت میں انہیں فیکٹرز Factors کا نام دیا تھا۔ بعد میں انھیں Genes کا نام دے دیا گیا۔ اسی سبب سے اس کے کام کو جینیات کے علم کی بنیاد کہا جاتا ہے۔

جسم کی کتاب ہدایت

سائنس کے طالب علم جانتے ہیں کہ ڈی این اے ایک مالکیوں ہے۔ مالکیوں بہت سے یعنی ذرات سے مل کر بنتا ہے۔ ڈی۔ این۔ اے مالکیوں بھی مختلف اقسام کے ایٹمیوں Atoms سے مل کر بنتا ہے۔

ڈی این اے تمام ذی حیات کے خلیوں میں پایا جاتا ہے۔ اسے آپ کسی بھی ذی حیات کے اندر ایک کتاب ہدایت کی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ یہ کتاب کیمیائی حروف سے لکھی جاتی ہے۔ حروف سے لفظ بنتے ہیں، الفاظ سے جملے، جملوں سے پیراگراف اور پیراگرافوں کے مجموعے سے پوری کتاب وجود میں آ جاتی ہے۔

انسانی ڈی این اے پر ساری تحریریں چار حروف سے لکھی گئی ہیں اور یہ حروف ہیں A.T.G.C۔ جسم کی کتاب ہدایت میں ہر لفظ ان میں سے کسی بھی "تین حروف" (یعنی کیمیکلز) سے مل کر بنتا ہے۔ یہ لفظ دراصل ایک کوڈ یعنی خفیہ پیغام یا خفیہ حکم ہوتا ہے۔ ایسے کئی احکامات کے مطابق ایک خاص طرح کی پروٹین بنتی ہے۔ ڈی این اے کی چار بیس Base ہیں۔ ہیں دراصل انہی چار حروف یعنی A.T.G.C کو کہا جاتا ہے۔ یہ حروف ایڈی میں، سائٹوں میں، گوانین، اور تھائی مائن نامی کیمیکلز کے ناموں کے ابتدائی حروف ہیں یعنی ڈی، این، اے کی چار کیمیائی بنیادیں۔

انسانی خلیے میں جینوم (ڈی این اے) دو میٹر لمبا اور حد بصارت سے بالاتر ہوتا ہے۔ اس کے اندر T، A، G، C جیسے لاکھوں کروڑوں جوڑے (pairs) ہوتے ہیں۔ ان لاکھوں کروڑوں جوڑوں کو پڑھنا اور ان سے بننے والے کیمیائی پیغامات، الفاظ یا ہدایات کو سمجھنا آسان کام نہیں تھا اسی لیے 1990ء میں اس پروجیکٹ کا آغاز بیک وقت چھ ممالک میں سولہ ریسرچ سینٹرز میں سینکڑوں سائنس دانوں نے شب و روز کام کرنے شروع کیا۔

ہیو مین جینوم پر اجیکٹ نے کیا معلوم کیا؟

اس تحقیق کے نتائج سے پہلی بار یہ بات معلوم ہوئی کہ انسانی جینوم یعنی DNA میں 32 کھرب بیس پیر پائے جاتے ہیں جب کہ جینز یا ہدایات کی تعداد 30000 ہزار سے 40000 ہوتی ہے۔ حیران کن بات یہ ہے کہ یہ تمام جینز DNA کے صرف تین فیصد حصے پر پائی جاتی ہیں۔ باقی 97% DNA کو ماضی میں سائنس دانوں نے ”جنک ڈی این اے“ کا نام دیا تھا یعنی کچھ DNA لیکن بعد کی تحقیقات سے یہ بات عیاں ہو چکی ہے کہ اسی بظاہر بے کار کا کچھ حصہ جینز کو بتاتا ہے کہ کس خلیے میں اور کن حالات میں اسے کیا کام کرنا ہے اور کس رفتار سے کرنا ہے یا سرے سے خاموش ہی رہنا ہے۔

ذراء سے اختلاف سے کتنے چھرے، کتنے رنگ

بیس پیر یعنی بنیادی جوڑوں کا مطلب تو آپ سمجھو ہی گئے ہوں گے کہ ڈی این اے کے دہرے دھاگوں پر ایک دوسرے کے سامنے چار میں سے کوئی ایک کیمیکل موجود ہوتا ہے۔ ان آمنے سامنے والے کیمیکلز ہی کو بیس (Base Pair) اور ان دونوں کو ملا کر بیس پیر (Base Pair) کہا جاتا ہے۔

تحقیق سے یہ حیران کن حقیقت بھی سامنے آئی کہ ڈی، این، اے میں بیس پیرز کی ترتیب تمام انسانوں میں 99.1% یکساں ہوتی ہے۔ اسی لیے ہزار طرح کے تضادات کے باوجود انسان انسان ہی نظر آتا ہے۔ چہروں، شکلوں، رنگوں، لہجوں، مزاجوں، کے اندر جو اختلاف پایا جاتا ہے اس کا سبب 32 کھرب بیس پیرز کی ترتیب میں 0.1% فیصد اختلاف ہے۔

ہم آپ کو یہ بھی بتا دیں کہ 99.9 فی صد جینز تمام انسانوں میں یکساں ہوتی ہے۔ 98.5 فی صد جینز انسانوں اور گوریلانسل کے بندروں میں مشترک ہوتی ہیں۔ 90 فی صد جینز انسانوں اور چوہوں میں ایک سی ہوتی ہیں اور 7 فی صد جینز بیکٹیریا اور انسانوں میں یکساں پائی جاتی ہیں۔ (اقتباس: DNA جسم کی کتاب ہدایت)

هر انسان دوسرے سے مختلف کیوں؟

آپ نے دیکھا کہ امام علیہ السلام نے انسانوں کی شکل و صورت میں اختلاف کی طرف کم و بیش ساڑھے تیرہ سو سال پہلے انسانوں کو متوجہ کیا تھا۔ امام کے دور سے کم و بیش ہزار سال کے بعد مغربی دنیا کے سائنس دانوں نے اس موضوع پر کام کیا اور انسانوں کی شکل و صورت، عادات و اطوار چال، ڈھال، رنگوں اور مزاجوں میں اختلاف کے اسباب معلوم کیے۔

ہمارا ایمان ہے کہ امام معصوم ہر چیز کی حقیقت، ہر شے کی بنیاد اور ہر شے کے ظاہر و باطن سے آگاہ ہوتے ہیں۔ امام جعفر صادق علیہ السلام تمام حقائق سے واقف تھے لیکن کیا یہ سائنسی معلومات جو آج سے ہزار سال قبل امام علیہ السلام کو معلوم تھی، انھیں آج سے ہزار سال پہلے کسی انسان کے سامنے بیان کیا جا سکتا تھا؟

جانداروں کے جسم ایک مخصوص حد کے بعد کیوں نہیں بڑھتے!

امام جعفر صادق علیہ السلام نے مفضل ابن عمرؓ کو ایک حیران کن سوال کی طرف متوجہ کیا یہ ایک ایسا سوال تھا جس کے بارے میں اٹھارویں صدی عیسوی تک دنیا میں کسی نے غور نہیں کیا تھا۔

امام علیہ السلام نے فرمایا:

”مفضل تم نے کبھی سوچا کہ انسان ہوں یا دوسرے جاندار یہ پہلے پچھے ہوتے ہیں پھر ان کے جسم میں نشوونما ہوتی رہتی ہے لیکن ایک خاص حد کے بعد ان کے جسموں (مثلاً قد و قامت) کا بڑھنا رک جاتا ہے حالانکہ وہ ہر طرح کی غذا میں اسی طرح کھاتے رہتے ہیں لیکن ایک خاص حد کے بعد ان کے جسم (یعنی قد و قامت) میں اضافہ نہیں ہوتا۔“

اس میں حکیم مطلق کی ”تدبیر“ یہ ہے کہ حیوانات کی ہر قسم اور نسل کے جسموں کا قد و قامت ایک مخصوص حد تک رہے۔ یہ نہ کم ہو، نہ زیاد ہے، اگر یہ اجسام بڑھتے ہی رہتے تو ان کی کوئی حد نہ رہتی حتیٰ کہ ان کی پہچان باقی نہ رہتی۔

نوٹ: عظیم معجزہ

آئیے ایک نظر ڈالتے ہیں کہ وہ کون سا نظام ہے جو ہمارے قد و قامت کا تعین کرتا ہے، اس کام کی نگرانی کرتا ہے اور ہمارے قد و قامت کو ایک حد تک پہنچنے کے بعد مزید بڑھنے سے روک دیتا ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے اس کے لیے "تدبیر" کا لفظ استعمال کیا ہے۔

اس لیے کہ ساتویں صدی عیسوی کے دور میں وہ باتیں ایک عام انسان کے تصور سے بھی بالآخر تھیں جنہیں مغربی دنیا کے ماہرین حیاتیات نے گزشتہ تین چار سو سال میں اپنے مسلسل تجربات، مشاہدات، اور جدید سائنسی آلات کی ایجاد کے بعد معلوم کیا۔ لیکن آج بھی ان کا کہنا ہے کہ ہم نے جسم انسانی کے بارے میں بہت کچھ معلوم کیا ہے لیکن درحقیقت بہت کم معلوم کیا ہے۔

جسم انسانی کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کئی مقامات پر امام نے لفظ "تدبیر" کہنے پر اکتفا فرمایا۔ اس لیے کہ آپ اگرچہ سب کچھ جانتے تھے لیکن جو کچھ جانتے تھے اسے سمجھانے کے لیے سننے والے افراد میں اس ذہنی صلاحیت کا ہونا ضروری تھا جس کے ذریعے وہ علم کی گہرائیوں اور باریکیوں کو سمجھ سکیں۔

بہر حال میڈیکل سائنس کی روشنی میں امام کے کام کی گہرائیوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ امام علیہ السلام کے اس مختصر اور جامع کلام کی تشریع کے لیے، میں DNA، دماغ، اعصابی نظام اور غددوں کے حیران کن نظام پر نظر ڈالنا ہوگی۔ پہلے ڈی این اے کے حوالے سے بات کرتے ہیں۔

قد و قامت.....DNA کی ہدایات کے مطابق

انسان کی تخلیق کا آغاز ماں باپ کے 23-23 کروموزموں والے دوناً مکمل خلیوں کے ملنے سے ہوتا ہے۔ عام خلیوں میں 46 کروموزم ہوتے ہیں۔ دو تولیدی نصف خلیوں کے ملنے سے 46 کروموزم کا خلیہ بنتا ہے۔ اس خلیے کو کیا کرنا، کس طرح کرنا، کیا بنانا ہے، کس طرح بنانا ہے، خام مال کہاں سے آئے گا۔ کس طرح آئے گا۔ اس نئے پیدا ہونے والے انسان کے اعضاء کس طرح بنیں گے، کس میٹریل سے بنیں گے، کہاں لگیں گے، کب کام کرنا شروع کریں گے، اس کی ہڈیاں کس مادے سے تیار ہوں گی اور کب مکمل ہو کر مزید بڑھنا بند ہو جائیں گی۔

اس نئے انسان کے بالوں، آنکھوں اور جلد کارنگ کیسا ہو گا، اس کی چال ڈھال، مزاج کیسا ہو گا، نہیاں اور دھیاں کی کون کون سی خصوصیات اس کی زندگی میں آئیں گی، اسے کون سی

بیماریاں لاحق ہوں گی۔ یہ اور ان کے علاوہ ہزاروں باتیں اس بار آور تولیدی خلیے کے ڈی این اے کے ماں باپ کی طرف سے آنے والے دودھاگوں پر کوڈز کی شکل میں لکھی ہوتی ہیں۔

یہ بار آور خلیہ رحم مادر کی دیوار سے چپلتا ہے تو نئی زندگی کا آغاز ہو جاتا ہے۔ رحم مادر کی دیوار سے اس خلیے کو تو انائی حاصل ہوتی ہے۔ اس تو انائی کی مدد سے یہ خلیہ (جو حد بصارت میں بھی بہ مشکل داخل ہوتا ہے۔) اپنے اندر موجود پروگراموں کو کسی کمپیوٹر کی طرح کھولنا شروع کرتا ہے۔ مختلف پروگرام، ونڈوز، اور کمائنڈز کام کرنے لگتی ہیں۔

یہ خلیہ ایک سے دو۔ دو سے چار، پھر آٹھ، سولہ، بیس ہوتے ہو تے کھربوں خلیوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور اس میں موجود ڈی این اے جو اس کی تخلیق کا نقشہ ہے ہر خلیے میں کاپی ہوتا رہتا ہے۔ (البتہ خون کے سرخ خلیوں میں ڈی این اے کاپی نہیں ہوتا کیونکہ انہیں کچھ بنانا نہیں ہوتا۔)

یہ کھربوں خلیے مختلف اعضاء کو بناتے ہیں اور ڈی این اے کی ہدایات کے مطابق بناتے ہیں اور نوماہ یا اس سے کم مدت میں ایک نوزائیدہ انسان دنیا میں آنکھ کھولتا ہے لیکن اس کے بعد بھی اس کے جسم کی تعمیر ڈی این اے کی ہدایات کے مطابق جاری رہتی ہے۔ اور جب اس کا جسم مکمل، بالغ ہو جاتا ہے تو 21 سال کی عمر میں ڈی این اے کی ہدایات کے مطابق اس کی ہڈیاں بڑھنا رک جاتی ہیں۔ البتہ ڈی این اے کی نگرانی میں جسم کی ٹوٹ پھوٹ کوٹھیک کرنے اور اس کی نگرانی کا کام زندگی کی آخری سانس تک جاری رہتا ہے۔

اعصابی نظام

اعضاء کے مکمل ہو جانے کے بعد ہمارے جسم کی دنیا میں ہر لمحے، قدرت کے ہزاروں میں جائز رونما ہوتے رہتے ہیں۔ ان سارے بر قی کیمیائی، یا میکنیکل کاموں کو سرانجام دینے میں ہمارے جسم کے اندر موجود 2 مختلف نظام کام کرتے ہیں۔ ایک اعصابی نظام اور دوسرا غدوں (یعنی گلینڈز اور ہارمونز) کا نظام جسے انڈو کرائی سسٹم کہا جاتا ہے۔

اعصابی نظام جسم کی ضروریات یا کسی ایز جنسی کی صورت حال سے دماغ کو آگاہ کرتا رہتا ہے اور دماغ کے احکامات کو جسم کے ایک ایک خلیے اور عضو تک پہنچاتا ہے۔ جسم کے اعضاء دماغ کے احکامات پر عمل کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

غدد کا نظام

آپ کے ارد گرد درجہ حرارت بڑھتا ہے تو جلد کے اندر موجود اعصابی نظام اس کی اطلاع دماغ کو فراہم کرتا ہے۔ دماغ کے اندر موجود ہائی پو تھیلی مس جلد کا درجہ حرارت کم کرنے کے لیے مطلوبہ ضروریات کا اندازہ لگا کر دماغ میں موجود پیچوڑی گلینڈ کو اس کی اطلاع دیتا ہے۔ پیچوڑی گلینڈ ایک ہارمون جاری کرتا ہے۔ جو سینکڑوں کے اندر جلد پر پھیلے ہوئے پسینے کے میں لاکھ غدد تک پہنچتا ہے۔

اس ہارمون میں پسینے کے غدد کے لیے یہ حکم موجود ہوتا ہے کہ وہ اپنے پانی کے ذخائر کا منہ کھول دیں۔ اس کے ساتھ ہی پانی آپ کے مسامات سے باہر نکلنے لگتا ہے آپ کو پسینہ آنے لگتا ہے اور باہر کی ہوا اور پانی کی مدد سے آپ کی جلد ٹھنڈی ہونے لگتی ہے۔

اسی طرح اعصابی نظام دماغ کو بتاتا ہے کہ دورانِ خون گاڑھا ہور رہا ہے تو دماغ دوسری طرح کا ہارمون جاری کرتا ہے اور آپ کو پیاس لگنے لگتی ہے۔ ایسا ہی بھوک کے معاملے میں ہوتا ہے۔

حریان کن بات یہ ہے کہ دماغ اعصابی نظام کے ذریعے چوبیں گھنٹے پورے جسم کی نگرانی کرتا ہے اور تمام بیرونی اور اندر وی اعضاء ہر لمحہ چیک اینڈ بیلنس کے اس نظام کی نگرانی میں کام کرتے ہیں۔

اعضاء کے سائز کو کس طرح کنٹرول کیا جاتا ہے؟

اعضاء کی نشوونما کے لیے بھی یہی حریان کن نظام چوبیں گھنٹے کام کرتے ہیں۔ جسم کو اس کی ضروریات کی فراہمی کے لیے بھی یہی دونوں نظام ہر لمحہ تیار رہتے ہیں۔ اگر یہ نظام کام کرنا بند کر

دیں یا اعتدال کے ساتھ کام نہ کریں تو انسان کا قد و قامت کسی بچے کی طرح بہت مختصر بھی ہو سکتا ہے اور کسی دیوزاد کی طرح بہت زیادہ لمبا بھی۔ آپ اخبارات میں طویل القامت، یا پستہ قد افراد کے بارے میں پڑھتے ہیں تو اس کا سبب دراصل ان کے ڈی این اے کی کسی خاص جین (GENE) یا دماغ میں موجود پیچوٹری گلینڈ میں کوئی خرابی ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ نشوونما سے متعلق ہار موں کو اعتدال سے زیادہ یا کم خارج کرنے لگتا ہے۔

انسان کو تکلیف کیوں محسوس ہوتی ہے؟

اب ہم دوبارہ امام علیہ السلام کے کلام بلاغت کی طرف لوٹتے ہیں۔

امام علیہ السلام نے فرمایا:

”تم نے سوچا مفضل! کہ انسان کو تکلیف کیوں محسوس ہوتی ہے۔ دیکھو! کام کا ج کرنے سے آدمی تحک جاتا ہے۔ اسے احساس ہوتا ہے کہ اس نے ضروریاتِ زندگی کی فراہمی کے لیے محنت مشقت کی ہے (اس طرح اسے محنت سے کمائی ہوئی آمدی کو استعمال کرنے میں خوشی حاصل ہوتی ہے۔)

اور یہ بھی ہے کہ اگر انسان کو درد یا تکلیف محسوس نہ ہوا کرتی تو وہ متکبر ہو جاتا۔ ایسی صورت میں اس کا نفس اسے بد کاریوں اور گناہوں کی طرف متوجہ کرتا۔ خوفِ خدا اس کے دل سے نکل جاتا۔ وہ نہ اللہ کے سامنے جھکتا اور نہ لوگوں پر مہربان ہوتا۔

اسی لیے جب کوئی شخص کسی درد یا تکلیف میں بستلا ہوتا ہے تو اللہ کی بارگاہ سے رجوع کرتا ہے۔ خضوع و خشوع کے ساتھ اپنا

جانداروں کے جسم ایک مخصوص صد کے بعد کیوں نہیں بڑھتے؟

سر جھکا دیتا ہے۔ صدقہ و خیرات کرنے لگتا ہے اور اپنے پروردگار سے درد اور تکلیف کے دور ہونے کے لیے دعائیں مانگتا ہے۔“

(دوسروں سے اس کا روئیا اگر پہلے متکبرانہ تھا تو بیماری کی صورت میں عاجزانہ ہو جاتا ہے۔)

”ویکھو مفضل! انسان میں درد اور تکلیف کو محسوس کرنے کی صلاحیت کے اور بھی بے شمار فوائد ہیں، اس کے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی، مثلاً اگر انسان کو تکلیف ہی نہ ہوا کرتی تو مجرموں کو ان کے جرم کی سزا کیسے دی جاتی۔ (آپ لاکھ کوڑے مارتے رہیں لیکن کوڑے کھانے والے کو تکلیف ہی نہ ہوتی وہ مزے سے کوڑے کھاتا رہتا) اسی طرح بچے کسی سزا سے نہ ڈرتے تو وہ مختلف علوم کس طرح سیکھتے!

نوٹ: درد یا تکلیف ہم کس طرح محسوس کرتے ہیں؟

ہمارے جسم کے بیرونی اور اندروںی حصوں میں ہر جگہ اعصابی خلیے موجود ہیں جو جسم کے اندر ہونے والی تکلیف، یا جسم پر لگنے والی چوٹ کی اطلاع ہر لمحے دماغ کو فراہم کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح ہماری جلد پر مختلف اقسام کے دباؤ، کو محسوس کرنے والے اعصاب ہیں جن کی مدد سے آپ پتھر کے وزن سے لے کر ایک مچھر یا چیزوں تک کا وزن محسوس کر سکتے ہیں۔

یہ اعصابی نظام ہر تکلیف کی اطلاع دماغ کو فراہم کرتا ہے۔ دماغ ان اطلاعات کی بنیاد پر اس تکلیف کو محسوس کرتا ہے اور اس سے بچاؤ کی تدبیر کرتا ہے ان تدبیر میں پٹھوں کا سخت ہو جانا اور جسم کا مختلف زاویوں پر مژننا شامل ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے جسم کے ہر حصے کی تکلیف دماغ محسوس کرتا ہے لیکن خود دماغ کے بعض آپریشن ایسے ہوتے ہیں کہ مریض ہوش میں ہوتا ہے لیکن اسے کسی قسم کی بھی تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔

جانداروں کے جسم ایک مخصوص حد کے بعد کیوں نہیں بڑھتے؟

درد اور تکلیف محسوس کرنے کی یہ صلاحیت اللہ کی عظیم نعمتوں میں سے ہے اس لیے کہ اگر انسان درد یا تکلیف محسوس نہ کرے تو وہ معانج سے شاید ہی رجوع کرے۔ اسے معلوم ہی نہیں ہو سکے گا کہ اس کے جسم میں کیا خرابی پیدا ہو رہی ہے جس کا علاج نہ کرایا گیا تو یہ بیماری اس کی مدت زندگی کو وقت سے پہلے ختم کر سکتی ہے۔

اسی طرح بھوک، پیاس، یا جسم کی دوسری خواہشات کا احساس ہونا بھی دماغ سے جسم اور جسم کے دماغ کے درمیان پھیلے ہوئے اعصابی نظام ہی کے سبب ممکن ہوتا ہے۔

درد اور تکلیف اللہ کی مصلحت

امام جعفر صادقؑ نے درد اور تکلیف کی حکمت بیان کرنے کے بعد مفضل ابن عمرؓ سے فرمایا:

”درد و تکلیف کے کیا فائدے ہیں، وہ میں نے تم سے بیان کیے۔ ابن ابی العوجاجیسے خدا کو نہ ماننے والوں کا کہنا ہے کہ دنیا میں جو کچھ پیدا ہوا، وہ بغیر کسی خالق و مبدِر کے پیدا ہو گیا۔ ان کے جاہلانہ خیالات کے مطابق انسان کو جو درد یا تکلیف ہوتی ہے اس میں حکمت و مصلحت نہیں ہے جب کہ درد اور تکلیف کے اپنے فائدے ہیں جو میں تم سے بیان کر چکا۔

میں نے اب تک صرف انسان کے جسم کے اندر موجود، جیران کن اعضاء ان کی کارکردگی، ان اعضاء کے درمیان باہمی رابطے، جن کے ذریعے انسان کی زندگی برقرار رہتی ہے، ان سب کے بارے میں تمہارے سامنے جو حقائق بیان کیے وہی ایسے ہیں کہ اگر کوئی آدمی ان پر غور کر لے تو اسے معلوم ہو جائے

گا کہ یہ سب کچھ ایسے ہی پیدا نہیں ہو گیا۔

اس کے پچھے ایک خالق کی ذات ہے جس نے انسانی زندگی اور اس کی ضروریات کے مطابق انسانی جسم کو خلق فرمایا ہے۔

میرے بیان کی روشنی میں تم اگر غور کرو گے تو معلوم ہو گا کہ اللہ تعالیٰ عز و جل کی ہر تدبیر (پلانگ، منصوبہ بندی) بے خطا ہوتی ہے۔

اس میں کہیں کوئی غلطی، بھول چوک نظر نہیں آتی، یہاں جس چیز کی جس قدر ضرورت ہوتی ہے، وہ مہیا رہتی ہے اور جس کی ضرورت نہیں ہوتی وہ مہیا نہیں کی جاتی.....”

مفضل ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ امامؐ کی گفتگو ابھی جاری تھی کہ زوال کا وقت آگیا۔ آقا امام جعفر صادق علیہ السلام نماز کے لیے اٹھے اور فرمایا:

”مفضل! اب تم کل صحیح اسی وقت میرے پاس آ جانا۔ کل میں تمہارے سامنے انشاء اللہ حیوانوں، درندوں اور پرندوں کی ساخت، ان کی خلقت میں اللہ تعالیٰ کی حکمتیں اور مصلحتیں بیان کروں گا۔

مفضل ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ امامؐ کی جانب سے ان معلومات کے حاصل کرنے سے مجھے انتہائی خوشی محسوس ہوئی اور علم کی جو نعمت مجھے حاصل ہوئی تھی اس پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہوا گھر واپس آیا کہ آقا علیہ السلام نے مجھے کیا کچھ عطا نہیں کیا اور کیا کیا چیزیں ہیں جو مجھے تعلیم نہیں دیں۔

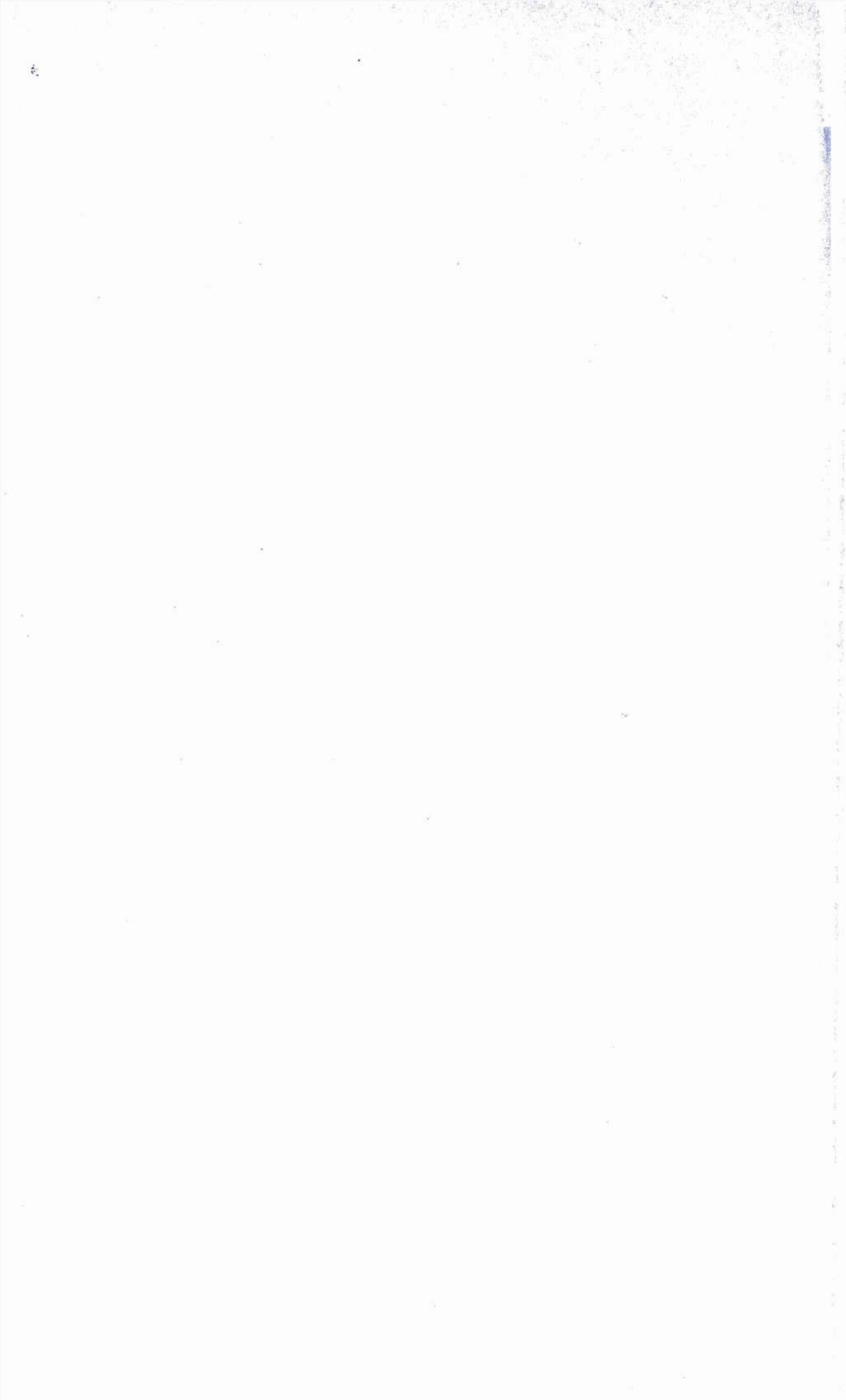
.....

توحید مفضل کی ان تین جلدوں کی سائنسی تحریکات کے لیے درج ذیل
کتابوں سے استفادہ کیا گیا۔

- HOW THE BODY WORKS by Steve parker.
- Amazing Book Of Facts published by mike kelly publishing ltd. china
 - Junior Science Encyclopedia By Keith Solomon
 - I Am Geo's Body By J.D Radcliffe
- Reproduction And Heredity by Regency Publishing
 - How Nature Works By David Burnie
 - Medicine by Steve parker
- The Natural World By Heather Amery
- Facts And Records By Kingfisher Publisher Newyork
 - Brain By Richard Walker
 - Microlife By David Burnie
- The Universe by Time-Life Books (USA)
- The Way Nature Works by Macmillan publishing company new york
 - How The Earth Works By John Farndon
 - Stars And Planets by Ian Ridpath
 - The Weather By dick File
 - Ecology By Steve Pollock
- Earth By Susanna van Rose
- Outer Space By Harry Ford And Kay Barnham
 - Desert By Miranda Macquitty
 - Insect By Laurence Mound
- The Five Ages Of Universe by Fred Adams And Greg Laughlin
 - Genes And DNA By Richard Walker
- Jism Kay Ajaibaat By Muhammad Ali Syed
- D.N.A Jism Ki Kitaab E Hidayat By Muhammad Ali Syed









قبل از انسانیت تہصیل

محمد علی سید اپنی نوجوانی سے ہی علم و دوست اور ادب شناس ہیں۔ انہیں شعرو شاعری اور تحریر مدونین سے ہمیشہ عملی و لچکی رہی ہے۔ اس کا ثبوت ان کی وہ کتابیں ہیں جو آج قارئین کی دست رہی میں ہیں اور بڑی حد تک چونکا دینے والی ہیں اور سب سے بڑھ کر ان کا یہ تحقیقی کام جوانہوں نے توحید مفضل پر سرانجام دیا ہے، انتہائی قابل قدر اور ستائش کے لائق ہے۔

علامہ طالب جوہری

توحید مفضل یقیناً ایک ایسی کتاب ہے جو مغرب کی سائنسی ترقی کے مقابلے میں مسلمانوں کو روایتی احسان کمتری سے باہر نکالنے کی بھرپور طاقت رکھتی ہے۔ پروفیسر جمیل حسن کاظمی اس خاکسار جیسے کم اور ناقص اعلم کے لیے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ تجربہ علمی سے مالا مال حضرت امام جعفر صادقؑ جیسے امام کامل کے کلام پر اپنی کوئی رائے دے سکے یا اس پر کوئی تبصرہ کر سکے۔ لیکن یہ ضرور ہوا ہے کہ ان دروس کے مطالعے سے اس خاکسار کے دل و دماغ پر امامؑ کا علمی مقام و مرتبہ مزید واضح اور بلند ہو گیا ہے۔

پروفیسر بدرا الدجی خان

یہ کتاب توحید مفضل ہی کے نام سے مشہور ہے اور عربی، فارسی اور اردو زبان میں دنیا کے متعدد ممالک سے شائع ہوتی رہی ہے۔ لیکن اس سے پہلے اس کی شرح کبھی نہیں لکھی گئی۔ یہ سعادت اللہ تعالیٰ کی جانب سے محمد علی سید کو حاصل ہوئی۔

علامہ سید رضی جعفر نقی

امام جعفر صادقؑ نے اس دور میں مفضل ابن عمرؓ کو لکھوائی جب سائنسی انداز سے سوچنے کا روانیج تک نہیں تھا۔ لیکن اس کتاب میں امامؑ نے ان موضوعات پر گفتگو فرمائی جو آپؐ سے کم و بیش ہزار سال بعد سائنسی علوم کی بنیاد ثابت ہوئے۔

ڈاکٹر وقار یوسف عظیمی

پیش نظر کتاب کو اگر مطالب کے لحاظ سے اعجاز امامت قرار دیا جائے تو اس کی حیرت انگلیز اور ماہر انہ سائنسی تشریح اس نسل پاک کے ایک لائق فرزند کی کرامت ہی قرار پائے گی۔

ڈاکٹر نعیم انور نعمنی

ISBN: 978-969-9738-14-2

H FOUNDATION

Bazar No. 3

12770